

# بساختہ



آکرم معصومہ  
۱۴۲۸ھ

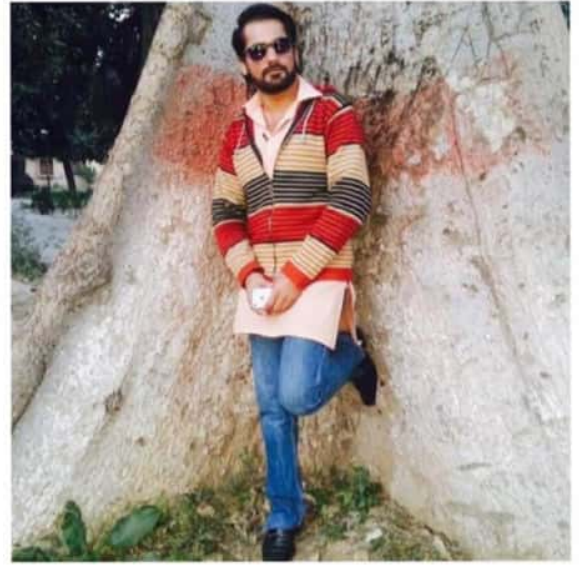
تمام کتابیں بغیر کسی مالی فائدے کے پی  
ڈمی ایف کی جاتی ہیں -  
مصنف کے خیالات سے ہمارا متفق ہونا

ضروری نہیں -  
فیس بک گروپ  
کتابیں پڑھئے

ایڈمن - سید حسین احسن

0344-818-3736

0314-595-1212



ساختہ

اکبر معصومہ

رنگ ادب پبلی کیشنز

Title: "Sunset in broken mirror"

photographic image by

Bing Wright (USA)

Lay out: Afif khalid

جملہ حقوق شاعر کے ہجرتی صائم عبداللہ کے نام محفوظ ہیں

بے ساختہ

اکبر معصوم

اشاعتِ اول: ۲۰۱۸

ناشر: رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی

خطاطی: سمیع اللہ ابوبیک

کمپوزنگ: حبیب الرحمن اعوان

قیمت: پانچ سو روپے

ترتیب

کائنات حسین غائر

پبلی کیشن کی جدید ٹیکنالوجی کے مطابق کتاب کی اشاعت کے لیے رابطہ کیجیے

**رنگِ ادب پبلی کیشنز**

آفس نمبر 5- کتاب مارکیٹ، اردو بازار، کراچی

0336-2085325 - 0345-2610434 - 0300-2054154 - 021-32761100

Email: rangeadab@yahoo.com - www.facebook.com/rangeadab



دکھتی ہے باہر سے دنیا بہت  
مگر اس نگینے کے اندر ہوں میں

والدہ محترمہ  
رقیہ بانو کی یاد میں

ماں کہتی تھی، دکھ تو رہے گا دنیا میں  
جیسے سب رہتے ہیں میرے لال رہو

## فہرست

9	☆... جینے کی تیاری میں
19	☆... دیر آید
21	☆... حمد
22	☆... نعت (التجائیہ)
24	☆... یہ سارے پھول یہ پتھر اُسی سے ملتے ہیں
27	☆... خود سے نکلوں بھی تو رستہ نہیں آسان مرا
29	☆... بس خواب بیچتا ہوں، بناتا نہیں ہوں میں
31	☆... شیشے کا یہ مکان ابھی ہے، ابھی نہیں
33	☆... نیند میں گنگنا رہا ہوں میں
35	☆... خواب آرام نہیں، خواب پریشانی ہے
37	☆... چھوڑ یہ بود و باش کسی دن
39	☆... میں لفظوں سے کھیا اور خاموشی ہار گیا
40	☆... عالم رنگ و بو ہمارا ہے
42	☆... وحشی نے جب تان لگائی وادی تک آواز گئی

- 44 .....سُن، ہجر اور وصال کا جادو کہاں گیا
- 46 .....ہوں آسماں کے زمانے کا، دوں نشانی کیا
- 48 .....یہ گل جس خاک سے لایا گیا ہے
- 50 .....یوں کوئی چپ کی تان لگتی ہے
- 51 .....یہ جواک شاخ ہے، ہری تھی ابھی
- 52 .....پکھلنے کو تیار اکثر ہوں میں
- 54 .....گر نیند میں وہ خواب کا پیکر بھی چلے گا
- 56 .....اب بھی اکثر دھیان تمہارا آتا ہے
- 58 .....رات ہے اور ماہتاب ہے اور
- 60 .....دل کو گلزار کی مٹی سے بنایا ہوتا
- 61 .....یوں ہماری طرح دلدار کہاں ہوتے ہیں
- 63 .....یہ ساری دھول مری ہے یہ سب غبار مرا
- 65 .....پھول ہاتھوں میں، پاؤں میں زنجیر
- 66 .....کیا خبر تھی کہ یوں زیاں ہوگا
- 69 .....وہ رنگ رہا جب تک
- 71 .....ضروری نہیں خود کشی کیجیے
- 73 .....شعلہ نکل، نہ آتش رخسار
- 75 .....سکھی رہو اور دکھ سے مالا مال رہو
- 77 .....اصل تیری قیس اے مردِ آئینہ
- 79 .....درود یوار تک لگتے ہیں بوجھل
- 81 .....گئے فراق میں تارے کون
- 83 .....خاک سے اٹھ کر، اوپر دیکھو
- 85 .....پل بھریا جیون بھر دیکھو
- 87 .....عکس بہار دکھاتے ہیں کیا نازک تن کی کیاری میں
- 89 .....یہ جیون کا، جل کیسا ہے، یہ شیشے کا پل کیسا ہے



- 91 .....خیر محمد انجم کے لیے
- 92 .....نور سے پُرایا غ تھا اپنا
- 93 .....درد، ممکن نہیں دوا ہو جائے
- 95 .....بن کے اپنے لیے ہی غیر رہیں
- 96 .....اُس آبِ زِ معانی سے
- 98 .....اے مرے خندہٴ صبح، گریہ شب، کون ہے تُو
- 100 .....آدمی کوئی شہر بھر میں نہیں
- 102 .....بہت ہی کم ہیں جو نظروں سے بچ نکلتے ہیں
- 104 .....کچھ نشہ رات کی نماز کا ہے
- 106 .....عجب کیا سنگ جائے، سر نہ جائے
- 108 .....خوشی نہیں غم پڑتا ہے
- 110 .....کوئی اڑنے کو آسمان نہیں
- 112 .....تم بھی بدتر کو بہترین کہو
- 114 .....لاکھ وحشی ہے خرد باختہ ہے
- 115 .....دریچہ کھلا ہے بیابان کا
- 117 .....کوئی طرفہ ستم کیا جائے
- 119 .....نقہ تھا اس قدر، کہ نہیں تھا حواس میں
- 121 .....اُس کی تصویر چمک جاتی ہے
- 123 .....نہ جلتا ہے نہ بجھتا ہے نظر میں
- 125 .....دھنک کو دیکھیے تو جی لگا کے
- 127 .....زہرِ مجھ میں جو ہے محبت کا
- 129 .....بے درد، ترے درد کا احساس کروں کیا
- 131 .....میں عشق سے جب نہ باز آیا
- 133 .....بدن سے سیر کو ایسے بدی نکلتی ہے
- 134 .....منتظر تھے بس اک دراڑ کے سب

- 136 .....معنی رکھتی ہے نہ بے معنی ہے
- 138 .....ہوں شہر کا باشندہ نہ جنگل کا ہوں باسی
- 139 .....ہوا ہے، پھول ہے، آبِ رواں ہے
- 141 .....بن بھی سکتی ہے یہ تصویر بنا کر دیکھو
- 143 .....کچھ میری زمیں تھی یہاں دریاؤں سے پہلے
- 145 .....ایک انبوہ تماشا ہوں میں تنہا ہو کر
- 147 .....دل کو بھی کچھ سکوں ہو ذرا درد چاہیے
- 148 .....چمک چمک کے ستارے مجھے بلاتے ہیں
- 150 .....کمرے سے اک روز نکل کر دیکھوں گا
- 152 .....اُس خوش ادا کے آئینہ خانے میں جاؤں گا
- 154 .....اُڑا شاخ سے اور فلک ہو گیا
- 155 .....کام تو نے کیا تمام مرا
- 157 .....گھر کے لوگوں کو جگاتا کیوں نہیں
- 159 .....ہم کو ایک زمانے تک

## جینے کی تیاری میں

مجھے اکبر اور اس کی شاعری دونوں سے پیار ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس محبت میں ”شکوہ جواب شکوہ“ یا نذیر و وعید والی کوئی بات نہیں۔ ۲۰۰۰ء میں ۲۷ غزلوں پر مشتمل اس کی پہلی کتاب ”اور کہاں تک جانا ہے“ چھپی۔ اس دوران عزیز ابن الحسن کے ہاں کتاب اور صاحب کتاب دونوں سے ملاقات رہی۔ تب وہ شدت سے اپنے حصار میں تھا۔ وہ ”ریڈ اینڈ وائٹ“ کے کش لگا کر محبوبہ کے سرخ ہوتے چہرے اور خون سفید ہونے کی باتیں کرتا تھا۔ یہ دُھواں، دھڑکن اور سفیدی اس کی شاعری اور رویوں میں آج بھی دکھائی دیتی ہے۔ بُری شاعری پر لکھنا پڑے تو اس کا خون سفید ہو جاتا ہے اور نتیجے میں کچھ دوستوں سے ہاتھ بھی دھونے پڑ جاتے ہیں، جسے وہ پار و ناپا قبول بھی کر لیتا ہے۔ باقی رہے دُھواں اور دھڑکن، تو اگر میں یوں کہوں کہ دُھواں سنائی دیتا ہے اور دھڑکن دکھائی دیتی ہے تو یہ بھی غلط نہ ہوگا کہ وہ شاعر ہی نہیں، مصوّر بھی ہے۔ سمعی سے بصری اور بصری منظر سے تمثال گری کے گروں کا گیان رکھتا ہے۔

تو جنگل سانس لیتا ہے مرا بھی

ہوا چلتی ہے تصویرِ شجر میں

تو بات تھی ملاقات کی۔ ہم سر جوڑ کر بیٹھتے، ہجر و وصال کے جادو کی باتیں کرتے، مگر شاعر کو درپیش ”ازلی ہجر“ سے متعلق حتمی نتیجہ برآمد کرنے میں ناکام رہتے۔ میں ”یہ وہ“ کہتا، وہ سنتا اور ”نہیں“ میں جواب دیتا۔ وہ جواباً شعر سناتا، میں اسے کسی چوکھٹے میں فٹ کرتا اور وہ مکر تا۔ بغاوت اور انکار اس میں بہت ہے، اتنا کہ اگر ہماری قوم میں تقسیم کر دیا جاتا تو آج مجھے اپنے بچوں سے یہ نہ سننا پڑتا کہ ”جب بجلی چلی جاتی ہے تو ہم آپس میں باتیں کرتے ہیں۔“

باتوں میں وہ آج بھی پہلے جیسا ہی ہے؛ خوش مزاج، لطیفہ باز اور بلا کا حاضر جواب۔ اس کے رویے میں ریاکاری، تصنع نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ کبھی کبھار تو اس میں بچوں جیسی معصومیت، سادگی اور حیرت دکھائی دیتی ہے۔ اس کے کردار کی مہک اور گفتار کی چمک بوجھل نہیں کرتی۔



اکبر کے منہ سے آرٹ اور کرافٹ پر لمبی چوڑی باتیں میں نے نہیں سنیں اور جن سے سنی ہیں اُن کے ہاں دیکھی نہیں۔ وہ کبھی کبھار اب بھی ماضی کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ ”ایسا کیوں ہوا؟“ وہ ماضی پرست نہیں، مگر اتنا جانتا ہے کہ ماضی کا مطالعہ کیوں کیا جاتا ہے؟

ہے کسی اور سے پر گزر اوقات مری

دن خسارہ ہے مجھے رات ہے نقصان مرا

جو ایک کمرے میں کائنات لیے بیٹھا ہو اُس کے امروز و فردا کا حساب سہل نہیں ہوتا۔ ”شبِ ہجر اُن“ والی باتیں نہ بھی ہوتیں تو اکبر کے وجود کے تقاضے، معاملات، مسائل یا مطالبات کیا کم تھے۔ بات محض اُس کے باطن کے جوار بھاٹوں، حسرتوں تک ہی محدود نہیں۔ ہم سب کا جو حال ہے، وہ کیسا ہے؟ ”یہاں کتنا کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔“

۱۹۶۱ء میں سانگھڑ میں پیدا ہونے والا اکبر علی ایک انتہائی پیچیدہ عضلاتی بیماری (Proximal Myopathy) میں مبتلا ہے۔ جس کا پتا ۱۹۸۹ء میں لاہور جا کر چلا۔ پہلے بھی چل جاتا تو وہ کیا کرتا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ تدریجاً معذور کر دینے والی یہ بیماری لا علاج ہے۔ ۱۹۹۴ء میں ایک دوسرے مرض، ٹی بی نے جکڑ لیا جس کے نتیجے میں وہ قطعی مفلوج ہو گیا اور اُس کی سننے، بولنے، دیکھنے اور چکھنے کے علاوہ دیگر صلاحیتیں معطل ہو گئیں۔ اُسے فوری طور پر آپریشن کی صعوبت سے گزرنا پڑا۔ اُسے شدید تکلیف سے تو نجات مل گئی مگر وہ پوری طرح اس بحر ان سے نکل نہیں سکا۔ رفتہ رفتہ وہ اس قابل ہو گیا کہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر جیسے تیسے زندگی کی دوڑ میں شامل رہ سکے۔ عضلاتی بیماری کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ اسکول کالج کے زمانے سے تھی۔ چلتے ہوئے بار بار گرنا، کبھی خود کو گرنے سے بچانا، لڑکھڑانا، چوٹ کھانا تو کہیں اس عیب کو ہر مندی سے چھپانا۔

گر جاتا ہوں روز ہی میں اونچائی سے

آج ذرا یہ خواب سنبھل کر دیکھوں گا

اکبر یار! یہ زندگی تُو نے کیسے گزاری ہے؟ تیرا دکھ بڑا ہے یا شاعری؟

ہم آپ جانتے ہیں کہ بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپے، ہر دور کی، اپنی اپنی سماجی، معاشی، نفسیاتی اور جسمانی ضروریات اور کردار ہوتا ہے۔ رویے، عادات و اطوار، لباس، دلچسپیاں، جذبات و احساسات، مسرتیں اور حسرتیں وغیرہ وغیرہ۔ بچپن میں پریوں کی کہانیاں اچھی لگتی ہیں تو جوانی میں پریاں۔ مگر ٹھہریے ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا بات تھی بچپن کی، لڑکی نہیں لڑکے کے بچپن کی۔ تو اس عمر میں



آنکھ پھولی، ہنسی مذاق، لڑائی، مار گٹائی، کھیل، ورزش سب چلتے ہیں۔ ادراک ہو کہ نہ ہو، بچہ ہو یا بڑا، کسی نہ کسی شکل میں اپنا آپ منوانے کے جتن کرتا ہے، تاج محل ایسے تو نہیں بنتے۔ تو جیسے سبھی کرتے ہیں اُس نے بھی ویسے ہی کام کیے اور شاعری، خطاطی، مصوری اور ڈرائنگ بھی۔ ”میں ذہین تھا“ ہوگا بھی۔ شاعری کے علاوہ اُس کی فنکاری کا کوئی نمونہ میرے سامنے نہیں۔ مصوری کی بات تو غالب نے بھی اپنے مہ رُخوں والے شعر میں کی ہے۔ ”اور اُس کی گھڑی سازی.....“ اس پر بھی تبصرہ فضول ہے! مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ گھڑی مونٹ ہے اور گھڑیاں مڈگر۔ گھڑی اور گھڑیاں سے یاد آیا؛ جب کہیں ”بات چلی“ تو اُس نے جو جواب دیا وہ بھی سنیے: ”اپنی اصل بیماری اُسے بتا دوں گا پھر جو اُس کی مرضی“۔ اب تو کچھ بھی درونِ ذات نہیں۔ ”مجھ کو خود سے بھی کوئی آس نہیں“۔ اور ساتھ ہی ”لیکن یہ میرا عجز ہے انکار نہیں ہے“ وغیرہ۔ سوچے کہیں ایسے بھی.....۔ یہ کہہ کر اُس نے نماز کی نیت باندھ لی اور ادھر سے فارغ ہوا تو سرزمینِ حجاز کی بات چھیڑ دی۔ اُس کی یہ حرکتیں دیکھتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ جیسا میں شفیق ہوں ویسا ہی وہ معصوم۔ آج کل ہم دونوں ہومیو پیتھ ہیں۔ آپ حسن ظن رکھیے چکمہ قبیلے والے کسی اور طرف رہتے ہیں ادھر تو سب.....۔

اب مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ایسی باتوں کے بیچ میں اکبر کی موجودہ حالت کا ذکر کروں تو کیسے؟ تدریجاً معذور کر دینے والی بیماری مایو پیتھی نے اکبر کا اب یہ حال کر دیا ہے کہ سفر تو درکنار، پانی پینے، نوالہ منہ میں ڈالنے، قلم کتاب پکڑنے، ٹی وی کے چینل بدلنے، شیو کرنے، نہانے دھونے، کپڑے بدلنے، کروٹ لینے جیسے معاملات میں بھی اُس کے ہاتھ پاؤں درست سمت حرکت کرنے میں بہ آسانی ساتھ نہیں دیتے۔ باقی رہی زبان تو اس کی گوہر افشانی غزل کے متاثرین سے پوچھیے۔

ذرا یہ شاعری بھی پڑھ کے دیکھو

یہ اک مردے کی زندہ داستاں ہے

صبح نو بجے کال کروں تو دس بجے جواب آتا ہے: ”یار معلوم ہو گیا تھا یہ تم ہو، مگر میں کپڑے بدل رہا تھا۔“ ایسی بیماریوں کے اثرات محض مریض کی ذات تک ہی محدود نہیں رہتے؛ اُسے سنبھالنے والوں کا بھی دماغ گھوم جاتا ہے کہ ”اور کہاں تک.....؟“ ایسے عالم میں کبھی سوال ہیں تو جواب نہیں اور کبھی جواب ایسے کہ جواب نہیں۔

”خزاں میں گرتے زرد پتے، بہار میں کھلتے سُرخ گلاب، تپتی گلیوں میں گھومتے دیوانے، تیلیوں کے پیچھے دوڑتے بچے اور کسی چوک چوراہے سے تعاقب کرتی کسی مہربان کی آواز سننے ایک عرصہ بیت

چلا ہے۔“ تم ایسی زندگی کے بارے میں کیا سوچتے ہو؟  
 ”آدمی زندگی اور اس کی ضروریات سے بھاگ کر کہاں جاسکتا ہے؟ ستم یہ ہے کہ بہت اذیت  
 ناک ہونے کے باوجود بھی زندگی میں کچھ نہ کچھ کشش اور خوبصورتی باقی رہ جاتی ہے تو قیدی سانس  
 لینے پر مجبور ہے۔“

دکھتی ہے باہر سے دنیا بہت  
 مگر اس سنگینے کے اندر ہوں میں  
 شعر! تو کیا شعر ہی اُس کی طرف سے زندگی کی ساری اذیتوں کا جواب ہے۔  
 شاعری کیا ہے؟ ایک بیان ہی تو ہے تجربات اور احساسات کا۔ میں نے اکبر کی بیماری کے ذیل  
 میں جو لکھا ہے، ایسے میں بدگمانی، مایوسی، حسرت، خوف، بغاوت، بے یقینی اور تشکیک جیسے منفی رویوں  
 کا پیدا ہو جانا حیران کن بات نہیں ہوتی۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اُس میں ایسے منفی رویے میں نے  
 دیکھے نہیں۔ نہ اُس کی زندگی میں، نہ شاعری میں۔ یہی اکبر کا فن ہے اور یہی تہذیب۔ اب ذرا یہ شعر  
 دیکھیے کہ اُس نے اپنی صورتِ حال کو کس طرح بیان کیا ہے۔

دیکھ لے کیسا کارواں تھے ہم  
 اور کیا بے جرس گئے جاناں  
 وہ جن کیفیات اور تجربات سے گزر رہا ہے اور اُس کے جو مسائل اور مطالبات ہیں ان کے تصور  
 سے بھی جان جاتی ہے، چہ جائے کہ وہ شاعری جو اس سب سے گزرنے کے بعد صادر ہو رہی ہے۔  
 اگر دو دن آدمی کے دانت میں درد ہو تو روزمرہ، محاورہ اور لغت تک بدل جاتی ہے۔ ایسے عالم میں آدمی  
 جتنی احتجاجی، انقلابی اور رومانوی باتیں کرتا ہے، اُس کے ”تخیل کی شادابی“ جو گل کھلاتی ہے، فکر و  
 احساس کو جو جلا ملتی ہے، یا زبان و بیان میں جو تبدیلی آتی ہے وہ اللہ جانتا ہے یا گھر والے۔

اکبر کی شاعری حقیقی تجربات، احساسات اور کیفیات کی آئینہ دار ہے اور اس سے جو سوالات پیدا  
 ہوتے ہیں وہ اس کے وجود کا تقاضا ہیں، مصنوعی نہیں۔ یہاں ”معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود“ کی  
 تختی گلے میں لٹکانے والوں کا حال تو یہ ہے کہ جن سے سوٹ کی سلوٹ تک برداشت نہیں ہوتی وہ  
 چاک گریبانی کی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کس سچائی، کس حقیقت کو مانتے ہیں؟ اور کن چیزوں کو محبوب  
 رکھتے ہیں؟ اور اگر محبوب سے شکایت ہے تو محبوب بدل لیں یا پھر اپنا پرفیوم بدل کر دیکھیں۔ معاف  
 کیجیے میں ہنر کے معیار میں اقدار کے بازار کی طرف نکل گیا۔ یہ بہکنا بھٹکنا بھی تو آدمی کی سرشت میں

ہے۔ ایسے ہی جیسے اکبر کا رویہ یا تجربہ اُس کے کلام میں رواں دواں ہے۔ اُس نے جو دیکھا، سمجھا، کھویا اور پایا اسے بیان کر ڈالا، اتنی آسانی اور بے ساختگی سے، اگر انسان اپنے دل کی بات کہہ سکے تو اس سے بڑھ کر کیا بات ہے!

ایسا مردہ تھا میں کہ جینے کے  
خوف میں مبتلا رہا ہوں میں  
کوزہ گر کوزہ درویش بنانا تھا اگر  
مجھ گنہگار کی مٹی سے بنایا ہوتا  
بستر پہ گر رہی ہے سیہ آسمان سے راہ  
وہ چاندنی کہاں ہے؟ وہ مہ رو کہاں گیا؟  
خود سے نکلوں بھی تو رستہ نہیں آسان مرا  
میری سوچیں ہیں گھنی، خوف ہے گنجان مرا  
دن نکلتے ہی مرے خواب بکھر جاتے ہیں  
روز گرتا ہے اسی فرش پہ گل دان مرا  
خواب آرام نہیں، خواب پریشانی ہے  
میرے بستر میں اذیت کی فراوانی ہے

خواہ آپ اس سے دہشت زدہ ہوں یا حیرت زدہ۔ یہ وجود جو جبر، جنگ، لذت و اذیت کا اکھاڑا ہے۔ تماشا، تماشاگر و تماش بین۔ اسیر و آزاد۔ اکبر کے ہاں کیفیات و معاملات مختلف عنوانات میں ڈھلتے ہیں۔ پھر وہی مسرت، حیرت، حسرت، ملال، جمال، جلال، تنہائی، تشکیک، بے یقینی، بغاوت، خواب، عذاب، سراب وغیرہ۔ مگر اکبر کے ہاں پائی جانے والی جنگ آج کے انسان کے کرب اور ایسے کی داستان بیان کرتی ہے۔ اُس نے اپنی جنگ کے دائرے یا الاؤ کو اتنا پھیلا دیا ہے کہ اس کی پیش مجھے بھی محسوس ہو رہی ہے۔

اس کے ہوا کوئی مجھے آزار نہیں ہے  
جو مجھ کو میسر ہے وہ درکار نہیں ہے

اُس کے بعض شعر تو مجھے ایسی پُر اسرار دنیا یا کسی ایسے اجنبی سیارے پر لے جاتے ہیں جو ابھی تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ جہاں ایک پُر اسرار خاموشی ہے۔ حیرت اور ہیبت ہے۔ جہاں بگڑنے



اور سنور نے کا عمل کچھ اس انداز سے واقع ہوتا ہے کہ دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ کبھی مسرت سے کبھی حیرت و ہیبت سے۔ جہاں سناٹا، تجسس، تنہائی، خوف اور مسرت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مثلاً

اس خرابے میں کوئی اور بھی ہے  
آہ کس نے یہاں بھری تھی ابھی  
اپانک یاد آ جاتا ہے سب کچھ  
نکل آتی ہے پھر پھر سے کونیل  
آپ ہی بن رہی ہے اک صورت  
خود بہ خود چل رہی ہے ایک لکیر  
درد نے دل کو ڈھونڈ لیا  
پہنچا سانپ خزانے تک  
دن بھر جنگل کی آوازیں آتی ہیں  
رات کو گھر میں جنگل سارا آتا ہے  
ہاتھ آتا ہی نہیں اس کا خیال  
رنگ پکڑوں تو مہک جاتی ہے  
گھر کے لوگوں کو جگاتا کیوں نہیں  
مر چکا ہے تو بتاتا کیوں نہیں

اب ذرا بیانِ حسن میں حسنِ بیان دیکھیے۔ غزل، گیت کے قریب ہو کر ایک عجب نغمے میں ڈھل گئی ہے۔ یہاں خیال کی باریکی تو ہے مگر طرزِ ادا میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ یہی وہ سادگی ہے جسے پُرکاری کہتے ہیں۔

عکس بہار دکھاتے ہیں کیا، نازک تن کی کیاری میں  
سورنگوں کے پھول کھلے ہیں شیشے کی پھلوااری میں  
نئے نئے گور یہ نین ترے نیلے آکاش کے تارے ہیں  
یا دو موتی دمک رہے ہیں نیند بھری بیداری میں  
یہ تو بتا اے سندر لڑکی، اور اک جیون ہے کہ نہیں  
یہ جیون تو بیت چلا ہے جینے کی تیاری میں



کبھی بھور سے کوداگ لگے، کبھی اندھیارے میں آگ لگے  
 یہ دن اور رات کا کھیل ہے کیا، اس مکھ پر آنچل کیسا ہے  
 کیا یہ فنکارانہ بے ساختگی، تخیل، تحرک، تصویریں اور بیان کی سطح ”روایتی“ ہے؟ فیصلہ خود کیجیے۔  
 ”رد و قبول کا اختیار تو آپ کے پاس بھی ہے۔“ درج ذیل شعر دیکھیے؛ کس ریاضت اور مجاہدے کی  
 طرف اشارہ کرتا ہے۔

جو بھی ہوں میں وہ رفتہ رفتہ ہوں

میری جاں ایک دم نہیں ہوں میں

ممکن ہے کہ شاعر کے ہاں اس کے معنی کچھ اور نکلیں، مگر میرے نزدیک کائنات کا ایک عمومی  
 اصول یہ ہے کہ درجہ کمال بہ تدریج حاصل ہوتا ہے۔ خواہ پانی کا اُبلنا ہو یا آدمی اور درخت کی نشوونما۔  
 مجھے معلوم نہیں کہ اُس نے کس عالم میں یہ کہا۔ ویسے بھی شعر شرح سے گزرے تو وہ اپنی کثیر جہتی یا  
 معنویت سے نیچے آ جاتا ہے۔ کون سا شعر کب، کس عالم میں، کس واقعے، حادثے سے متاثر ہو کر لکھا  
 گیا اور کیا اس کے حقیقی معنی وہی ہیں جو ہم سمجھے ہیں؟ یہ تو اُس کا خالق جانے، یا ممکن ہے تب صرف  
 اس کی خلافت ہی مقصود ہو؛ اس کے نر اور مادہ ہونے کا سوال ہی درپیش نہ ہو۔ تو شعر اور اس کی تفہیم  
 کے حوالے سے میں ہمیشہ تذبذب میں پڑ جاتا ہوں، مثلاً ایک جگہ میں نے پڑھا کہ سلیم احمد کی شہرہ  
 آفاق نظم ”مشرق“ الیکشن میں جماعت اسلامی کی سیاسی شکست کے درد کا ثمر ہے۔ کوئی جگنو، تلی، تارایا  
 مہ پارہ نہیں بلکہ جماعت اسلامی کی سیاسی شکست اس نظم کی وجہ بنی؛ یعنی جماعت کی شکست کا دکھ۔ تو  
 کیا خیر اور خوبصورتی اسی میں تھی کہ جماعت یہ الیکشن نہ ہارتی؟ گزشتہ صفحات میں اکبر کا شعر لکھا ہے کہ  
 اس کے سوا کوئی مجھے آزار نہیں ہے

جو مجھ کو میسر ہے وہ درکار نہیں ہے

اب میں اگر اس کی تفہیم میں پڑوں تو مجھے خواہشات اور ضروریات کی بحث میں جانا پڑے گا۔ کیا  
 ضروری ہے اور کیا غیر ضروری؟ کیا حقیقی ہے اور کیا غیر حقیقی؟ اور ہمارے عہد میں غیر ضروری کو کیسے  
 ضروری بنا دیا گیا ہے۔ ہماری خواہشیں، آرزوئیں، اُمَنگیں، تمنائیں کتنی غیر حقیقی یا زہرناک ہوتی  
 ہیں، ان کے اُبھرنے کے پیچھے کیا سوچ کارفرما ہوتی ہے؛ پھر یہ دل و دماغ پر کس طرح اپنا قبضہ جماتی  
 ہیں اور کس طرح بد بختی و نامرادی کا سبب بنتی ہیں۔ ہماری غیر حقیقی آرزوؤں کو کیسے سجا سنوار کر،  
 دلفریب اور ہر کشش بنا کر سامنے لایا جاتا ہے، اور جو نادانی میں ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں یا اس

لامتناہی ریگزار کو سیراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ کیسی تکلیف سے گزرتے ہیں۔ ”جو ہے، نہ ہو گا۔“ سراب، پانی، اور ایک مبہم مستقبل کے لیے مسلسل پریشانی، نا آسودگی۔ کیا اکبر صرف ایک شاعر ہے، ساحر ہے اور اس کے ”منتر“ یا ”بھجن“ کسی دیوی کو رام کرنے کے لیے یا بلاؤں کو مٹانے کے لیے ہیں؟ قل اعوذ برب الناس پڑھ کر رائے دیجیے گا یہ شاعری ہے سیاست نہیں۔

بس آپ زبان و بیان دیکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ اُس نے یہاں اپنی کیفیت بیان کی ہے یا ہماری۔ مجھے تو اُس کے ہاں سرخ رنگ کے نارنجی، زرد، گلابی اور نیم گلابی، بنفشی اور مادرائے بنفشی ہونے کے درمیان کی کوئی حد مقرر کرنے میں مشکل ہوتی ہے۔ بنفشی بھی نکلا تو سرخ سے ہے، مگر درمیان میں الگ کرنے والی حد کی موجودگی ایک سوالیہ نشان ہے۔

سارے عالم پر چھلک گیا

میں بھرا ہوا ویرانی سے

دھیرے دھیرے کھیل گیا میں اپنے سارے رنگ

مایا سب کچھ جیت گئی میں مٹی ہار گیا

یہ اپنے پھول کھلاتی ہے اپنی مرضی سے

کوئی کرے گا محبت کی باغبانی کیا

یہ تجربہ ہے کتابوں میں تھوڑی لکھا ہے

میں اب بتاؤں تجھے ہجر کے معانی کیا

وہ بندِ قبا کھاتے ہی کھل جائے گا موسم

جادو ہے تو پھر آب و ہوا پر بھی چلے گا

دیکھے سے تو تصویر میں کیا جان پڑے گی

تم اُنھ کے چلو گے تو یہ منظر بھی چلے گا

اڑا شاخ سے اور فلک ہو گیا

مجھے تو پرندے پہ شک ہو گیا

جوانی میں کھلا تھا پھول کوئی

مرے دل پر ابھی تک اک نشان ہے

رنگ بیتاب تو ہوتے ہیں بکھرنے کے لیے  
 جس طرح آپ ہیں تیار، کہاں ہوتے ہیں  
 کبھی آتا ہے زمانوں میں کوئی ان کو پسند  
 آئے سب کے گرفتار کہاں ہوتے ہیں  
 اپنی طرف بھی دیکھ اگر دیکھتا ہے تُو  
 سورج مکھی کے پھول کدھر دیکھتا ہے تُو  
 اب یہ عالم ہے کہ بس یاد اُس کی  
 دل کے اندر ہی دھڑک جاتی ہے  
 ڈراتے ہیں مجھے صورت سے میری  
 عجب ہیں آئینے دشتِ بلا کے  
 بہت اندر ہی اندر رو رہا ہے  
 سمندر آنسوؤں سے بھر نہ جائے  
 کوئی بھی جھیل لے تنہائی اتنی سہل نہیں  
 یہ وہ سفر ہے کہ جنگل بھی ساتھ چلتے ہیں  
 تہذیب نہیں مگر آباد تھے ہم لوگ  
 سنتے ہیں یہاں شہر تھے صحراؤں سے پہلے  
 تیر گیا اس آنکھ میں آنسو  
 نیا دیکھو ، ساگر دیکھو  
 کوئی طرفہ ستم کیا جائے  
 شہر کا خوف کم کیا جائے  
 نہ جب چمن میں بہار آئی  
 تو پھر وہی فتنہ ساز آیا

یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ اکبر معصوم نے سندھی زبان کے نامور ادیب آغا سلیم کے ناول ”ہمہ  
 اوست“ کا اردو ترجمہ کیا ہے؛ اور سرائیکی، اردو اور پنجابی کے معروف شعراء انور سعید انور اور ڈاکٹر  
 ایاز سہروردی نے اکبر کی چند غزلوں کو سرائیکی میں ڈھالا ہے۔ ”جو بویا ہے وہی کاٹو گے۔“ اب اگر



اکبر اپنی غزلوں کے سرائیکی ترجمے پر ناخوش بھی ہے تو ہم خوش ہیں۔ باقی رہی آغا صاحب کی بات تو ان کی خیریت کی اطلاع یوں ہے کہ ”اور کہاں تک جانا ہے“ کے بعد اس ترجمہ کی اشاعت کی مسرت آغا سلیم کے ساتھ آصف فرخی کے حصے میں بھی آئی ہے۔ شاعری میں کم از کم ایک سہولت یہ تو ہوتی ہے کہ لباس ریڈی میڈ ملتا ہے مگر ترجمہ تو کڑا امتحان ہوتا ہے۔ جس میں لباس کی تیاری، تراش خراش، پیمائش اور کشیدہ کاری وغیرہ کے مراحل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ یہ ترجمہ اردو اور سندھی دونوں زبانوں پر اکبر کی دسترس، محنت اور محبت کا آئینہ دار ہے۔ یوں شاعری کے ساتھ ساتھ وہ ترجمہ کاری میں بھی اپنا اعتبار قائم کرانے میں کامیاب رہا ہے۔

گذشتہ سال اُسے اپنا نیک پنجابی زبان میں شاعری کا دورہ پڑا اور اس نے دو ماہ میں کتاب مرتب کر کے چھوادی جسے پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگویج آرٹ اینڈ کلچر نے ”نیندر پچھلے پہر دی“ کے نام سے شائع کیا ہے۔ لیکن مجھے یہ فتویٰ دینے میں تامل ہے کہ اس کی اردو شاعری زیادہ اچھی ہے، پنجابی شاعری، یا وہ خود۔۔۔

ہر چیز کا خاتمہ بالآخر یا شر ہوتا ہے۔ فی الحال اس مضمون کو یہیں ختم سمجھیں۔ میں تو تھک گیا۔ اب آپ جانیں، اکبر معصوم جانے اور اس کی شاعری۔

شفیق سہروردی

جھوک ایاز۔ حسن ابدال

۲۷ ستمبر ۲۰۱۷ء



## دیر آید

شاعری باطن سے پھوٹی ہے۔ خارجی عناصر کی شراکت کے باوجود یہ باہر سے اندر نہیں، اندر سے باہر آتی ہے۔ یہ آپ کو بیان کر سکتی ہے، اگر یہ شاعری ہے۔

میرے شب و روز کے حوالے سے شفیق سہروردی نے جو خامہ فرسائی کی ہے یہ بعض دوستوں کے لیے تکلیف دہ ہو سکتی ہے، مگر انھیں برداشت کرنا ہوگا۔ میں نے بھی تو کیا ہے۔ شفیق کو مجھ سے بہت ہمدردی ہے۔ ہوا کرے۔ بہت محبت ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر اس نے بڑی سفاکی سے کام لیا ہے۔ کیا کریں، حقیقت پسند آدمی کچھ بے رحم تو ہوتا ہی ہے۔ جو اس نے لکھنا چاہا میں نے لکھنے دیا۔ جو ہے، وہ ہے اور مستقل ہے تو پھر چھپانے سے کیا فائدہ۔ ویسے بھی یہاں کون سے گلاب مہک رہے ہیں۔ قطرہ قطرہ ہی یہ شاعری اذیتوں سے کشید ہوئی ہے۔ یہ مرا حال بھی ہے اور احوال بھی۔

کوئی بھی جھیل لے تنہائی اتنی سہل نہیں

یہ وہ سفر ہے کہ جنگل بھی ساتھ چلتے ہیں

مگر جنگلوں کی رفاقت اتنی خطرناک نہیں۔ بستیاں زیادہ بھیانک ہو گئی ہیں۔ محفلیں تو خوف کا شکار رہتی ہی ہیں، آدمی کی تنہائی بھی محفوظ نہیں رہی۔

دوسری کتاب تک آتے آتے سترہ برس لگ گئے، مگر ارد گرد کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا۔ ہاں، دھوئیں اور دھول میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔ وہی خلقت شہر ہے اور وہی غول بیابانی۔ ان سترہ برسوں میں کئی شفیق اور مہربان ہستیاں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ کچھ قریبی دوست اللہ کو پیارے ہو گئے اور کچھ دنیا کو۔ پھر بھی محبت کرنے والے بہت ہیں۔ ”تم اس کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“

یہاں بات کو سمیٹ لینا چاہیے۔ جو کچھ اس کتاب کی صورت میں آپ کے روبہ رو ہے، یہ حتمی اور آخری ہے۔ جو اشعار یا غزلیات کہیں بھی، کسی اور شکل میں موجود ہیں یا کتاب میں بوجہ شامل نہیں کیے گئے، وہ قطعی طور پر متروک تصور کیے جائیں۔ یہ اعلان محفوظات کی درستی کے لیے ہے۔

تہائی کی اس فصل سے ارد گرد پائے جانے والے پرندے جو خوشہ چینی کرتے ہیں، شاید یہ ان کا حق ہے۔ مگر جو ہمیشہ تاک میں رہتے ہیں وہ اس متروکہ مال پر ہاتھ صاف کرنا چاہیں تو ان پر بھی کوئی پابندی نہیں، کہ وہ پہلے بھی یہ مہربانی فرماتے رہے ہیں۔ نام لینا ضروری نہیں، ان تک میری آواز پہنچ رہی ہے۔ اور آپ تو خیر سن ہی رہے ہیں۔

اکبر معصوم  
ساگھڑ  
۲۴ ستمبر ۲۰۱۷ء

حمد

در ، دیوار ، دریچہ اُس کا  
گھر اُس کا ، باغیچہ اُس کا

ہم تو ہیں بس خاک برابر  
سارا اُونچا نیچا اُس کا

روز ہماری مٹی اُوپر  
بچھتا ہے غالیچہ اُس کا

کھیل رہی ہے ساری دُنیا  
دُنیا ہے بازیچہ اُس کا

نعت  
(التجانیہ)

کاسنہ چشم آج بھر دتجے  
اور مجھے بادشاہ کر دتجے

ہم کہ خود ہی میں کھو گئے ہیں کہیں  
پھر ہماری ہمیں خبر دتجے

قافلہ رُک گیا ہے رستے میں  
پھر ہمیں مژدہ سفر دتجے

روشنی ہے حضور کا سایہ  
میری راتوں پہ سایہ کر دیجے

بستیاں ہو رہی ہیں یہ برباد  
ان کو سچ مچ کے بام و در دیجے

یہ دعائیں کہ باریاب نہیں  
ان پرندوں کو بال و پر دیجے

اب یہ گونگا کلام کیسے کرے  
خامشی کو کلام کر دیجے



یہ سارے پھول یہ پتھر اُسی سے ملتے ہیں  
تو اے عزیز ، ہم اکثر اُسی سے ملتے ہیں

وہ ایک بار نہیں ہے ، ہزار بار ہے وہ  
سو ہم اُسی سے بچھڑ کر ، اُسی سے ملتے ہیں

یہ دھوپ چھاؤں ، یہ آبِ رواں ، یہ ابر ، یہ پھول  
یہ آسماں ، یہ کبوتر اُسی سے ملتے ہیں

ہے خاص سازِ ازل سے ، وہ دجلہ آہنگ  
یہ نیل و زمزم و کوثر اُسی سے ملتے ہیں

یہ موتیا ، یہ چنبیلی ، یہ موگرا ، یہ گلاب  
یہ سارے گہنے ، یہ زیور اُسی سے ملتے ہیں

عقیق و گوہر و الماس و نیلم و یاقوت  
یہ سب نگینے ، یہ کنکر اُسی سے ملتے ہیں

مہک اُسی کی ہے کافور اور صندل میں  
یہ زعفران ، یہ عنبر اُسی سے ملتے ہیں

یہ نیل کنٹھ ، یہ کول ، یہ راج ہنس ، یہ مور  
یہ سب فرشتے سراسر اُسی سے ملتے ہیں

اُسی سے ملتے ہیں یکسر یہ سارے موزوں قد  
یہ سارے سرو و صنوبر اُسی سے ملتے ہیں

یہ شعر گر ، یہ مصوّر ، یہ سارے بد اوقات  
یہ سب خیال کی چھت پر اُسی سے ملتے ہیں

غزالِ شعر ، غزالِ حرم ہوا معصوم  
کہ عجز و ناز کے تیور اُسی سے ملتے ہیں

خود سے نکلوں بھی تو رستہ نہیں آسان مرا  
میری سوچیں ہیں گھنی خوف ہے گنجان مرا

ہے کسی اور سے پر گزر اوقات مری  
دن خسارہ ہے مجھے ، رات ہے نقصان مرا

میرا تہذیب و تمدن ہے ، یہ وحشت میری  
میرا قصہ ، مری تاریخ ہے نسیان مرا



میں کسی اور ہی عالم کا مکیں ہوں پیارے  
میرے جنگل کی طرح گھر بھی ہے سنان مرا

دن نکلتے ہی مرے خواب بکھر جاتے ہیں  
روز گرتا ہے اسی فرش پہ گلدان مرا

مجھ کو جس ناؤ میں آنا تھا کہیں ڈوب گئی  
خواب ہے ، نیند کے ساحل پہ پریشان مرا

ہے مری خانہ خرابی سے یہ رونق معصوم  
اب جہاں شہر ہے ، ہوتا تھا بیابان مرا

بس خواب بیچتا ہوں ، بناتا نہیں ہوں میں  
لیکن یہ بات سب کو بتاتا نہیں ہوں میں

دُنیا سے مجھ کو اتنی محبت ضرور ہے  
بارش میں بھیگتا ہوں ، نہاتا نہیں ہوں میں

کرتا نہیں ہوں یاد کسی کو ملال میں  
ایسی ہوا میں پھول کھلاتا نہیں ہوں میں

اب تیرا کھیل، کھیل رہا ہوں میں اپنے ساتھ  
خود کو پکارتا ہوں اور آتا نہیں ہوں میں

بس روشنی سمجھ کے مجھے راہ ہو گیا  
وہ یہ سمجھ رہا تھا جلاتا نہیں ہوں میں

آساں نہیں ہیں میری اذیت کے داؤ پیچ  
مرتہا ہوں، اور، جان سے جاتا نہیں ہوں میں

معصوم بے قراری ہے میرے خمیر میں  
اڑتی ہے میری خاک، اڑاتا نہیں ہوں میں

شیشے کا یہ مکان ابھی ہے ، ابھی نہیں  
یہ دل کی آن بان ابھی ہے ، ابھی نہیں

اس شہر میں کرے بھی کوئی بود و باش کیا  
یہ شہر میری جان ! ابھی ہے ، ابھی نہیں

اک کھیل ہے جو کھیلتی رہتی ہے اُس کی یاد  
سینے پہ یہ چٹان ابھی ہے ، ابھی نہیں



بس دو گھڑی کی دھوپ ہے دنیا کہیں جسے  
سائے کا یہ نشان ابھی ہے ، ابھی نہیں

ہیں دل کے اختیار میں اب ناقہ ہائے شوق  
لیکن یہ ساربان ابھی ہے ، ابھی نہیں

معصوم اعتبار نہ کر آسمان کا  
سر پر یہ سائبان ابھی ہے ، ابھی نہیں

نہند میں گنگنا رہا ہوں میں  
خواب کی دُھن بنا رہا ہوں میں

ایک مدّت سے باغ دنیا کا  
اپنے دل میں لگا رہا ہوں میں

کیا بتاؤں تمہیں وہ شہر تھا کیا  
جس کی آب و ہوا رہا ہوں میں

اب تجھے میرا نام یاد نہیں  
جب کہ تیرا پتا رہا ہوں میں

آج کل تو کسی صدا کی طرح  
اپنے اندر سے آ رہا ہوں میں

ایسا مردہ تھا میں کہ جینے کے  
خوف میں مبتلا رہا ہوں میں

تھی وہ تنہائی بھی عجب معصوم  
جس سے آراستہ رہا ہوں میں

خواب آرام نہیں ، خواب پریشانی ہے  
میرے بستر میں اذیت کی فراوانی ہے

مجھ کو تو وہ بھی ہے معلوم ، جو معلوم نہیں  
یہ سمجھ بوجھ نہیں ہے ، مری نادانی ہے

کچھ انھیں سوچنے دیتا ہی نہیں اپنے سوا  
یہ مرا حلقہٴ یاراں مرا زندانی ہے



ہے مصیبت میں گرفتار مصیبت میری  
جو بھی مشکل ہے وہ، میرے لیے آسانی ہے

موجہ مے ہے بہت میرے سکوں پر بیتاب  
ضبطِ گریہ سے مرے جام میں طغیانی ہے

سب یہ تیرے لیے اسباب مہیا ہیں مجھے  
تیری خاطر ہی مری بے سروسامانی ہے

اب تو معصوم ہوا گھر سے نکلنا بھی محال  
خلقتِ شہر نہیں ، غولِ بیابانی ہے

چھوڑ یہ بود و باش کسی دن  
خود کو کریں تلاش کسی دن

لگے ٹھکانے خاک ہماری  
بلواؤ فرّاش کسی دن

کیوں سب کو اچھے لگتے ہو  
راز کرو یہ فاش کسی دن

پیارے پیچھی ، اُڑتے اُڑتے  
بن جاؤ آکاش کسی دن

دیکھنا ہجر زدوں کو آکر  
کہیں گے وہ ، شاباش ، کسی دن

ہم پر بھی اکرام کرے گا  
وہ دستِ گل پاش کسی دن

پتھر کی قسمت جاگے گی  
آئے گا نقاش کسی دن

گھل جائیں گی شہر کی آنکھیں  
بولے گی یہ لاش کسی دن

رنج گزیدہ ، خاک رسیدہ  
اُٹھیں گے خوش باش کسی دن

آئے گی معصوم سخن میں  
دل پر پڑی خراش کسی دن

## فیصل عجمی کے لیے

میں لفظوں سے کھیلا اور خاموشی ہار گیا  
اس کے بعد یہی ہونا تھا ، بازی ہار گیا

دھیرے دھیرے کھیل گیا میں اپنے سارے رنگ  
مایا سب کچھ جیت گئی ، میں مٹی ہار گیا

جیت لیے میں نے دریا سے اُس کے سارے گیت  
کشتی ، جال اور ایک سنہری مچھلی ہار گیا

آج ہوا سے پوچھ رہا تھا ، اپنے شہر کا نام  
اپنی وحشت سے لگتا ہے ، وحشی ہار گیا

میں جم کر معصوم جیا ، پر دیکھ سہمے کا داؤ  
آدھی عمر لگائی میں نے پوری ہار گیا

عالمِ رنگ و بو ہمارا ہے  
اور خالی سبُو ہمارا ہے

اک زمانے سے پیار ہے ہم کو  
اک زمانہ عدو ہمارا ہے

ہم اُسی آگ سے ہیں وابستہ  
ہاں وہی شعلہ رُو ہمارا ہے



تم بتاؤ کہ چاندنی کے سوا  
کیا لبِ آب جو ہمارا ہے

کس کو درکار ہیں یہ کون و مکاں  
ہم تو خوش ہیں کہ تُو ہمارا ہے

عشق نے جو تمہارا حال کیا  
بس وہی ہو ہو ہمارا ہے

وہ بھی کہتا ہے بُت پرست ہمیں  
جو نماز و وضو ہمارا ہے

پیرہن میں ترے ہے گل کی مہک  
اور گل میں لہو ہمارا ہے

بات اب کی نہیں ازل سے ہے طے  
تیغ تیری ، گلو ہمارا ہے

لوگ اُس کی طرف ہیں کیوں معصوم  
ذکر تو چار سُو ہمارا ہے

وحشی نے جب تان لگائی وادی تک آواز گئی  
بھول گیا پانی لہرانا ، مٹی سے پرواز گئی

کون تھا استقبال جو کرتا دل کے سونے ساحل پر  
یاد خوشی سے آئی تیری اور بہت ناراض گئی

چار طرف ہو کا عالم ہے بچپن کے میدانوں میں  
کہاں گیا زخمی شہزادہ ، کہاں وہ تیر انداز گئی

یہ شوقِ نظارہ آخر کچھ تو کام دکھائے گا  
دل کا پتھر پگھلے گا یا آج نگاہِ ناز گئی

حجرۂ خواب میں آکر اُس نے کھول دیے سب بندِ قبا  
ایک غزالی آنکھوں والی ہم کو رات نواز گئی

دھیمی دھیمی خوشبو آئی بس تیرے پیراہن کی  
آج صبا تو شہرِ گل کا کھول کے سارا راز گئی

ہے معصوم اس گھر کی رونق تنہائی کی صوتِ ہزار  
گھر آباد ہوا تو سمجھو پھر یہ سخن طراز گئی

سُن، ہجر اور وصال کا جادو کہاں گیا  
میں تو کہیں نہیں تھا مگر تُو کہاں گیا

جب خیمہ خیال میں تصویر ہے وہی  
وہ دشتِ نامراد وہ آہو کہاں گیا

بستر پہ گر رہی ہے سیہ آسماں سے راکھ  
وہ چاندنی کہاں ہے، وہ مہ رُو کہاں گیا

جس کے بغیر جی نہیں سکتے تھے ، جا چکا  
پر دل سے درد ، آنکھ سے آنسو کہاں گیا

پھر خاک اُڑ رہی ہے مکانِ وجود میں  
اے جانِ بے قرار ، وہ دل جو کہاں گیا

اُٹھی تھی دل میں یاد سی معصوم کیا ہوئی  
چکا تھا جو خیال میں جگنو کہاں گیا



ہوں آسماں کے زمانے کا ، دوں نشانی کیا  
سُنی نہیں ، کبھی تم نے مری کہانی کیا

مجھے ہے کام بہت اپنے ریگزاروں میں  
کروں میں جا کے ستاروں کی گلہ بانی کیا

اُتر رہے ہیں پرندے فلک سے کرنوں کے  
چمک رہا ہے مرے آئنے میں پانی کیا

یہ اپنے پھول کھلاتی ہے اپنی مرضی سے  
کوئی کرے گا محبت کی باغبانی کیا

تو اب خیال میں آنے میں بھی تاثر ہے  
خبر نہیں، ترے دل میں ہے بدگمانی کیا

یہ تجربہ ہے، کتابوں میں تھوڑی لکھا ہے  
میں اب بتاؤں تجھے ہجر کے معانی کیا

غزل میں چاہیے مقطع بھی اب تمہیں معصوم  
کرے گا نام مگر دل کی ترجمانی کیا

یہ گل جس خاک سے لایا گیا ہے  
اُسے افلاک سے لایا گیا ہے

چمن پہ رنگ آتا ہی نہیں تھا  
تری پوشاک سے لایا گیا ہے

یہ دل جس سے میں شرمندہ بہت ہوں  
اُسی بے باک سے لایا گیا ہے

اُجالا ہے جو یہ کون و مکاں میں  
ہماری خاک سے لایا گیا ہے

یہ جو کچھ بھی ہے آیا ہے کہاں سے  
دل صد چاک سے لایا گیا ہے

یہاں کتنوں نے دیکھا ہے جو طوفاں  
خس و خاشاک سے لایا گیا ہے

کرے معصوم کیا اپنا جنوں بھی  
کہ یہ ادراک سے لایا گیا ہے

یوں کوئی چپ کی تان لگتی ہے  
جی نہیں ، اس میں جان لگتی ہے

کوئی گاہک نہ ہو تو کیا کچے  
روز دل کی دکان لگتی ہے

کیا کہیں ، شہر کی خموشی بھی  
آپ ہی کا بیان لگتی ہے

پہلے کچھ کچھ یقین تھا دُنیا پر  
اب تو یکسر گمان لگتی ہے

ناؤ سی یاد کی کوئی معصوم  
رات کو دل سے آن لگتی ہے



یہ جو اک شاخ ہے، ہری تھی ابھی  
اس جگہ پر کوئی پری تھی ابھی

سر بہ سر رنگ و نور سے لب ریز  
اک صراحی یہاں دھری تھی ابھی

اس خرابے میں کوئی اور بھی ہے  
آہ کس نے یہاں بھری تھی ابھی

میں بناتا تھا اُس کے دل میں گھر  
اور قسمت میں بے گھری تھی ابھی

کوئی گذرا ہے سانحہ معصوم  
یہ فضا کیوں ڈری ڈری تھی ابھی

پگھلنے کو تیار اکثر ہوں میں  
خبر ہے تجھے کیسا پتھر ہوں میں

بہت اپنے خوابوں پہ تکیہ نہ کر  
ابھی تیرا بالین و بستر ہوں میں

دکٹی ہے باہر سے دُنیا بہت  
مگر اِس نگینے کے اندر ہوں میں

یہاں اب کوئی بھی کسی کا نہیں  
غنیمت ہے تم کو میسر ہوں میں

رہا ہے مجھے پتھروں سے شغف  
سو اب آنسوں پہ مقرر ہوں میں

میں تم جیسا ہو کے بھی خوش ہوں اگر  
تو بہتر نہیں، تم سے بدتر ہوں میں

وہ سفاکیوں میں بھی معصوم ہے  
فدا ان دنوں جس بلا پر ہوں میں

گر نیند میں وہ خواب کا پیکر بھی چلے گا  
ہمراہ تو پھر ماہِ منور بھی چلے گا

آنکھوں کو مہیا کر رونے کے لیے کچھ  
آنسو نہیں ملتا تو سمندر بھی چلے گا

وہ بندِ قبا کھلتے ہی، کھل جائے گا موسم  
جادو ہے تو پھر آب و ہوا پر بھی چلے گا

کچھ تاب و تواں دل میں بچا کر بھی نہ رکھی  
اب کس کو خبر تھی کہ وہ خنجر بھی چلے گا

دیکھے سے تو تصویر میں کیا جان پڑے گی  
تم اُٹھ کے چلو گے تو یہ منظر بھی چلے گا

جو رینگتا رہتا ہے مرے ساتھ زمیں پر  
وہ فتنہ کبھی اُٹھ کے برابر بھی چلے گا

بے عشق تو معصوم نہیں دل کی یہ رونق  
کچھ کام کروں گا تو مرا گھر بھی چلے گا



اب بھی اکثر دھیان تمھارا آتا ہے  
دیکھو ، گزرا وقت دوبارہ آتا ہے

آہ نہیں آتی ہے اب تو ہونٹوں تک  
سینے سے بس اک انگارہ آتا ہے

جانے کس دُنیا میں سوتی جاگتی ہیں  
جن آنکھوں سے خواب ہمارا آتا ہے

دن بھر جنگل کی آوازیں آتی ہیں  
رات کو گھر میں جنگل سارا آتا ہے

جن راتوں میں چاند ہو، یا پھر چاند نہ ہو  
یاد بہت اُس کا رُخسارا آتا ہے

کوئی کہانی سنتا ہے معصوم مری  
کبھی کبھی دل سے ہنکارا آتا ہے

رات ہے اور ماہتاب ہے اور  
آج حیرت سرائے خواب ہے اور

رُو بہ رُو ہے اُسی کا مصحفِ رُخ  
پڑھ رہا ہوں جو میں کتاب ہے اور

چیزے دیگر ہے پردہ داری ذات  
اور ہم سے ترا حجاب ہے اور

خوب اہلِ فراق جانتے ہیں  
موجِ دریا کا پیچ و تاب ہے اور

اے مصوّر کہیں دکھائی تو دے  
وہ جو تصویر میں گلاب ہے اور

ہم ہوسِ پیشگاں یہ کیوں نہ کہیں  
ہجر میں ہم کو اضطراب ہے اور

دل کو معصوم ہے خزاں نہ بہار  
رنگ و بو کا یہاں حساب ہے اور

دل کو گلزار کی مٹی سے بنایا ہوتا  
یا سگِ یار کی مٹی سے بنایا ہوتا

اتنا مشکل تو نہ ہوتا مرا جینا کہ مجھے  
یوں نہ انکار کی مٹی سے بنایا ہوتا

کوزہ گر، کوزہ درویش بنانا تھا اگر  
مجھ گنہگار کی مٹی سے بنایا ہوتا

کاش تُو نے کوئی ساتھی مری تنہائی کا  
میرے آثار کی مٹی سے بنایا ہوتا

ایک مدت سے یہ بیکار پڑی ہے معصوم  
کچھ دلِ زار کی مٹی سے بنایا ہوتا

یوں ہماری طرح دلدار کہاں ہوتے ہیں  
سب خرابے چمن آثار کہاں ہوتے ہیں

جن کو خوابوں میں بناتے ہیں بنانے والے  
اُن گھروں کے در و دیوار کہاں ہوتے ہیں

کبھی آتا ہے زمانوں میں کوئی ان کو پسند  
آئے سب کے گرفتار کہاں ہوتے ہیں



اُن کے آنے کی خبر سُن کے بہار آتی ہے  
ورنہ گلزار بھی گلزار کہاں ہوتے ہیں

رنگ بیتاب تو ہوتے ہیں بکھرنے کے لیے  
جس طرح آپ ہیں تیار، کہاں ہوتے ہیں

یہ نگیں پھیر کے لے جائیے بازاروں میں  
دل کے اتنے بھی خریدار کہاں ہوتے ہیں

مصحفِ شرق سے لے مصرعہ خورشید اٹھا  
روز یوں شعر نمودار کہاں ہوتے ہیں

کیا بتائے گا کوئی شکل و شباهت معصوم  
حُسن ہو تو لب و رخسار کہاں ہوتے ہیں

یہ ساری دھول مری ہے یہ سب غبار مرا  
گذر ہے تیرے خرابے سے بار بار مرا

خزاں تو کیا ، نہیں جس کی بہار کو بھی خبر  
اک ایسے باغ کے اندر ہے برگ و بار مرا

ہے دل کے نغمہ و نالہ سے اب گریز مجھے  
ملا ہوا ہے کسی اور لے سے تار مرا

میں خوش ہوں نان و نمک پر، تو اس کی داد نہ دے  
کہ بھیک مانگتا پھرتا ہے شہریار مرا

مرے وجود میں رہ میری خواہشیں مت گن  
کہ اس کھنڈر میں کبوتر ہے بے شمار مرا

نہ مجھ سے پوچھیے کیسے ہیں یہ فراق کے دن  
کہ مجھ سے روز بچھڑتا ہے ایک یار مرا

جہاں کو میں نے زرِ خاک سے خریدا ہے  
مرا غرور ہے معصوم انکسار مرا

پھول ہاتھوں میں ، پاؤں میں زنجیر  
دیکھ لائے گئے ہیں تیرے اسیر

آپ ہی بن رہی ہے اک صورت  
خود بہ خود چل رہی ہے ایک لکیر

اب تو یوں ہے کہ ہجر میں خوش ہیں  
ہو رہی ہے یہ وصل کی تدبیر

خانہ دل میں اب چراغ نہیں  
رہ گئی ہے چراغ کی تصویر

بجھ گیا کیوں یہ داغ سینے کا  
کیوں سیہ پڑ گیا یہ ماہِ منیر

اپنے ہی ہجر میں نڈھال ہوں میں  
خود ہی میں ماروی ہوں خود ہی ملیں

ہم ہیں معصوم اور نہ تم معصوم  
کارِ دنیا ہے سب کو دامن گیر

کیا خبر تھی کہ یوں زیاں ہوگا  
خواب دیکھوں گا اور دھواں ہوگا

عشق کرتے ہیں دیکھ لو ہم کو  
حال ایسے نہ پھر بیاں ہوگا

اک سفینہ بھرا ہوا خوں سے  
دیکھنا خاک میں رواں ہوگا



تُو نے رکھے تھے اپنے پھول یہاں  
اب یہ پتھر ترا نشاں ہوگا

مجھ کو پروا نہیں ہے تیرے بعد  
وقت ہوگا تو رایگاں ہوگا

اک ستارہ کہیں ہمارے لیے  
اب بھی ہوگا ، مگر کہاں ہوگا!

دل بھی معصوم خاک ہی نکلا  
میں سمجھتا تھا آسماں ہوگا

وہ رنگ رہا جب تک  
آہنگ رہا جب تک

ہم شیشہ بنے رہے  
وہ سنگ رہا جب تک

جب تک نہ چھو اُس کو  
بے رنگ رہا جب تک

وہ مجھ پر گھلا رہا  
میں تنگ رہا جب تک

ہم جنیں گے جینے کا  
یہ ڈھنگ رہا جب تک

معصوم تماشا تھا  
میں دنگ رہا جب تک

ضروری نہیں خودکشی کیجیے  
ہماری طرح زندگی کیجیے

نہیں عشق آساں تو اُلجھن ہے کیا  
جو سب کر رہے ہیں وہی کیجیے

کسی ماہ رُو سے لپٹ جائیے  
ذرا روح میں چاندنی کیجیے

اگر نیند آتی نہیں رات بھر  
تو خوابوں کی صورت گری کیجیے

وہ نازک بہت ہے سو ہدیہ اُسے  
گلِ خواب کی پنکھڑی کیجیے

ہیں معصوم پہلے ہی دشمن بہت  
ذرا دوستوں میں کمی کیجیے

شعلہٴ گل ، نہ آتش رخسار  
اب تو سچ مچ کی آگ ہے درکار

دل میں چلنے لگی ہے بادِ خزاں  
تُو کہاں ہے خدائے باغ و بہار

قیس جاتا ہے اپنے گھر کی طرف  
دیکھ ، اُٹھتا ہے آئینے سے غبار



بیچتا ہوں گلِ ہزارہ جاں  
اور قیمت لگی ہے اک دینار

آگئی نیند ، سو گئے سب لوگ  
کھل گیا شہرِ خواب کا بازار

اب تو دل پہ بھی ہے نگہ کم کم  
چشمِ بینا ہے ان دنوں بیمار

بات دُنیا کی چھوڑیے معصوم  
اپنے خوابوں کا دیکھیے انبار

سکھی رہو اور دکھ سے مالا مال رہو  
مست رہو، بدمست رہو، خوشحال رہو

سچ پوچھو تو جیون کا ہے یہی سبھاؤ  
مچھلی بن جاؤ یا جل یا جال رہو

دل اور دُنیا ایک ہی لے پر قائم ہیں  
تم جو چاہو بے سُر اور بے تال رہو

ہمیں تو ہو آنکھوں کی ٹھنڈک، راحتِ جاں  
شوق سے لیکن تم جی کا جنجال رہو

ماں کہتی تھی دُکھ تو رہے گا دُنیا میں  
جیسے سب رہتے ہیں میرے لال رہو

میں اکبرِ معصوم ہوں ، اتنا کافی ہے  
میر بنو تم ، غالب اور اقبال رہو

اصل تیری قیس اے مردِ آئینہ  
ریگِ صحرا ہے کہ گردِ آئینہ

رات تو میری ادائے مرگ پر  
دم بخود تھا رہ نورِ آئینہ

میرے اندر کرچیاں اڑتی ہیں کیوں  
دل میں کیوں اٹھتا ہے دردِ آئینہ

چاروں جانب زندگی کی ریت ہے  
جھیلتا ہوں گرم و سردِ آئینہ

ہے یہی بادِ خزاں ، روحِ بہار  
سرخ رُو ہے شہرِ زردِ آئینہ

کون واقف ہے خطِ زنگار سے  
کیوں لیے پھرتا ہوں فردِ آئینہ

عکس کیا معصوم دنیا کا پڑے  
جم گئی ہے دل پہ گردِ آئینہ

در و دیوار تک لگتے ہیں بوجھل  
بہت تنہائی ہے محفل میں، گھر چل

پری خانہ اُجڑ جاتا ہے دل کا  
اور آخر شہر ہو جاتا ہے جنگل

اچانک یاد آ جاتا ہے سب کچھ  
نکل آتی ہے پھر پتھر سے کونیل



ذرا کھل جائے ابر اُس پیرہن کا  
ابھی رنگوں سے ہو جائے گا جل تھل

اگر یونہی دیے جلتے رہیں گے  
ہوا اک روز ہو جائے گی پاگل

کہیں ہم حال کیا معصوم اپنا  
وہی ہم ہیں ، وہی دنیا کی دلدل

گئے فراق میں تارے کون  
نکلے یہ انگارے کون

کون چبائے اتنا کانچ  
اتنا وقت گزارے کون

رُکتی نہیں ہے ہنسی تیری  
تُو ہے اے دُھیارے کون

پردے میں ان آنکھوں کے  
کرتا ہے نظارے کون

آخر جان کی بازی ہے  
جیتے جی اب ہارے کون

کس کو اتنی فرصت ہے  
دیکھے خواب ہمارے کون

دنیا کھیل سہی معصوم  
کھیل رہا ہے پیارے کون

خاک سے اُٹھ کر، اُوپر دیکھو  
اور پھر سارا منظر دیکھو

دیکھو یہ دنیا کیسی ہے  
یہ تصویر اُلٹ کر دیکھو

ڈرتے کیوں ہو، اپنا چہرہ  
اپنے خوف کے اندر دیکھو

ماہ نژادو ، ہم لوگوں کے  
خواب نہ دیکھو ، بستر دیکھو

اُس کا نقش اُبھارو گے تم  
پہلے اپنا پتھر دیکھو

دل گوری کا ، کانچ کا پنچھی  
ٹوٹ بھی سکتے ہیں پر دیکھو

تیر گیا اُس آنکھ میں آنسو  
نیا دیکھو ، ساگر دیکھو

دیکھو مردہ مور کی آنکھیں  
کیسے زندہ ہے تھر دیکھو

دیکھو بٹی کیا کرتی ہے  
یا معصوم کبوتر دیکھو

پل بھر یا جیون بھر دیکھو  
منظر آنکھ برابر دیکھو

دن بھر خاک اڑاؤ اپنی  
ساری رات سمندر دیکھو

یہ لو میرے پنکھ لگا لو  
تھوڑا سا تو اڑ کر دیکھو

جانے کب سے سوئے نہیں ہو  
تکیہ ڈھونڈو ، بستر دیکھو

کیسا اُجلا دن نکلا ہے  
نکلا سیپ سے گوہر دیکھو

تکا تکا چونچ میں لانا  
کیسے بنتا ہے گھر دیکھو

شہر کی دیواروں کا کیا ہے  
جو لکھا ہے دل پر دیکھو

یوں معصوم لپٹ مت جانا  
پہلے موج کے تیور دیکھو



عکس بہار دکھاتے ہیں کیا نازک تن کی کیاری میں  
سورنگوں کے پھول کھلے ہیں شیشے کی پھلواری میں

نئے نکور یہ نین ترے، نیلے آکاش کے تارے ہیں  
یا دو موتی دمک رہے ہیں نیند بھری بیداری میں

بیس دنوں میں بیس برس کے آنسو تُو نے پونچھ دیے  
سب دکھ میرے بانٹ لیے ہیں لمحوں کی دلداری میں

رات گئے اپنی سانسوں سے تیری خوشبو آتی ہے  
دھیرے دھیرے چلتی ہے تُو اس دل کی رہداری میں

یہ تو بتا اے سندر لڑکی اور اک جیون ہے کہ نہیں  
یہ جیون تو بیت چلا ہے جینے کی تیاری میں

نام چھپا رکھا ہے تیرا، پردے میں ان لفظوں کے  
کیا کرتے کرنا پڑتا ہے یوں بھی دنیا داری میں

ریت بہت معصوم اڑتی ہے یاد کی خالی گلیوں میں  
اک پنچھی گاتا ہے لیکن اب بھی سرخ اٹاری میں

(ایک دوست کے لیے بطور خاص لکھے گئے)

یہ جیون کا ، جل کیسا ہے ، یہ شیشے کا پل کیسا ہے  
پلکوں سے چھو کے دیکھ ذرا ، یہ خواب ، یہ بادل کیسا ہے  
یہ کیسی دھوپ کی کایا ہے ، یہ کون سے روپ کی چھایا ہے  
یہ سچ مچ ہے یا مایا ہے ، یہ شہر یہ جنگل کیسا ہے  
کبھی مل جاتا ہے دشمن سے ، کبھی مول ملے نہ ساجن سے  
یہ پریم کا سونا کیا شے ہے ، یہ پیار کا پیتل کیسا ہے  
کوئی اس کی بات نہیں پاتا ، کوئی اس کے پار نہیں جاتا  
اس من ساگر میں پھیر ہے کیا ، اس ندیا میں بل کیسا ہے  
یہ میل ملن بیراگ ہے کیا ، اے ساجن سچ سہاگ ہے کیا  
یہ تن اور من کی لاگ ہے کیا ، یہ بندھن پل پل کیسا ہے  
یہ سات کٹورے پانی کے ، رکھے ہیں سچ سرہانے پر  
پھر ساجن پریم کی باتوں میں یہ بدھ یہ منگل کیسا ہے  
اس ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میں کیوں یہ تن من پگھلا جاتا ہے  
اس دھیمی دھیمی برکھا سے یہ دھیان میں جل تھل کیسا ہے

کبھی بھور سے کوداگ لگے، کبھی اندھیارے میں آگ لگے  
یہ دن اور رات کا کھیل ہے کیا اس مکھ پر آنچل کیسا ہے  
کبھی جگنو ہے، کبھی جوتی ہے، کبھی تارا ہے، کبھی موتی ہے  
بس جھلمل جھلمل ہوتی ہے، وہ شوخ وہ چنچل کیسا ہے  
اس اُجلے نزل مکھڑے پر یہ دن کا چندن کیونکر ہے  
ان سندر کوئل آنکھوں میں یہ رات کا اجل کیسا ہے  
رہیں نین ترے یہ لاج بھرے، رہیں جھولی میں پکھراج بھرے  
رہیں گوری تیرے چھاج بھرے، سچ کہو سانول کیسا ہے  
ہم سانجھ سویر کے روگی ہیں، بس دوپل کے سنجوگی ہیں  
ناں سادھو ہیں ناں جوگی ہیں ہم کیا جانیں کل کیسا ہے  
یہ سندر تا معصوم ہے کیا، مٹی میں مچی یہ دھوم ہے کیا  
یہ من ریشم کا گچھا سا، یہ تن کا مچل کیسا ہے

(انعام ندیم کی شادی کے موقع پر لکھے گئے)

خیر محمد انجم کے لیے

اپنی طرف بھی دیکھ اگر دیکھتا ہے تُو  
سورج مکھی کے پھول کدھر دیکھتا ہے تُو

نور سے پُر ایام تھا اپنا  
دل کہاں تھا ، چراغ تھا اپنا

آ رہا تھا وہ کاروانِ بہار  
اور یہاں گم سراغ تھا اپنا

ایک بنتِ چمن کی دُھن تھی مجھے  
ورنہ صحرا بھی باغ تھا اپنا

کیسے جائے خلل ، فدا اُس پر  
دل نہیں تھا ، دماغ تھا اپنا

ایک معصوم سا کبوتر تھا  
دل نہ شاہیں ، نہ زاع تھا اپنا

درد ، ممکن نہیں دوا ہو جائے  
اب ہمارے لیے دعا ہو جائے

کھلنے والا ہے وہ گلِ معنی  
چشمِ دل سے کہو کہ وا ہو جائے

کوئی حیران آنے میں رہے  
کوئی حیرت سے آنہ ہو جائے

میری سانسوں میں وہ شریک ہے کیوں  
دوسرا ہے ، تو دوسرا ہو جائے

دل میں ہے اور دل کی بات ہے وہ  
اُس کو کیسے کہیں ادا ہو جائے

زیر لب کچھ خن کلی نے کیا  
اس پہ اک مصرعہ صبا ہو جائے

آج معصوم ان سے کچھ نہ کہیں  
آج اظہارِ مدعا ہو جائے



بن کے اپنے لیے ہی غیر رہیں  
گر تری یاد کے بغیر رہیں

ان کو کیسی بہار ، کیسی خزاں  
جو خرابوں میں محو سیر رہیں

یونہی دائم رہیں تری آنکھیں  
یہ مرے آئے بخیر رہیں

تیرا حُسنِ سفر رہے قائم  
گلِ فشاں یونہی تیرے پیر رہیں

یارِ زندہ رہیں مرے معصوم  
وہ بھی ، جن کو ہے مجھ سے پیر رہیں

اُس آبِ زِرِ معانی سے  
ہے دید وضو عریانی سے

میں دل کے داغ جلاتا ہوں  
مکھ سورج کی تابانی سے

میں نے دنیا کو دیکھا ہے  
اُن آنکھوں کی حیرانی سے

سارے عالم پر چھلک گیا  
میں بھرا ہوا ویرانی سے

اب چیخے یا خاموش رہے  
کیا کہے کوئی زندانی سے

لاتا ہوں سخن پاتال سے میں  
لکھتا ہوں کہاں آسانی سے

معصوم ، کہاں تک صبر کروں  
میں تنگ ہوں اس سلطانی سے

اے مرے خندہٴ صبح، گریہٴ شب، کون ہے تُو  
مصرعہٴ دیدہٴ تر، مطلعِ لب، کون ہے تُو

بزمِ آرائی تری خلوتِ احساس میں ہے  
اے مری جانِ سخن، روحِ ادب، کون ہے تُو

میرا ویرانہ چمن ہے تری آرائش سے  
تجھ سے ہے قریہٴ جاں، شہرِ طرب کون ہے تُو

تجھ سے ملنے کی مسرت سے کھلا جاتا ہوں  
اور ہے تُو ہی مرے غم کا سبب کون ہے تُو

تیرے آنے سے عجب دل کو سُور آتا ہے  
کچھ بتا دُختِ صبا، بنتِ عنب، کون ہے تُو

ہے تُو کچھ اور ہی درکار و میسر کے سوا  
اے مرے عجزِ دُعا، حُسنِ طلب، کون ہے تُو

کون ہے، کون ہے، تُو کون ہے، معصوم بتا  
مجھ میں زندہ ہے مگر جان بہ لب، کون ہے تُو

آدمی کوئی شہر بھر میں نہیں  
اک خبر ہے کہ جو خبر میں نہیں

اڑ رہا ہے بہت بلندی پر  
اک پرندہ جو بال و پر میں نہیں

اپنے کمرے سے کب نکلتا ہوں  
اور کب حالتِ سفر میں نہیں

میرے عیبوں میں اب تلاش نہ کر  
روشنی جو ترے ہنر میں نہیں

ایک یہ دل کا درد کیا شے ہے  
کون سا درد ہے جو سر میں نہیں

خاک آئے نظر وہ زورِ نمو  
جو شجر میں ہے اور شجر میں نہیں

دل کا معصوم کیا کہوں احوال  
ایک عالم ہے جو نظر میں نہیں

بہت ہی کم ہیں جو نظروں سے بچ نکلتے ہیں  
زیادہ رنگ مرے دل کے ساتھ چلتے ہیں

میں ایک آئینہ رکھتا ہوں اور اک چہرہ  
وہ جن کے چہرے نہیں آئینہ بدلتے ہیں

کوئی بھی جھیل لے تنہائی اتنی سہل نہیں  
یہ وہ سفر ہے کہ جنگل بھی ساتھ چلتے ہیں



تمام رات جو کرتے ہیں گشت سڑکوں پر  
وہ سارے خوف ہمارے گھروں میں پلتے ہیں

عجیب بات ہے معمول کے یہ منظر بھی  
کبھی کبھی تو بہت آدمی کو کھلتے ہیں

خیال ذہن میں آتے ہیں خود بہ خود معصوم  
مگر یہ شعر کے سانچے میں کیسے ڈھلتے ہیں

کچھ نشہ رات کی نماز کا ہے  
کچھ تری چشمِ نیم باز کا ہے

گل میں، تجھ لب میں، کوئی فرق نہیں  
بس جو تھوڑا سا ہے گداز کا ہے

دل سنے گا خوشی کی بات کہاں  
یہ معنی تو سوز و ساز کا ہے

دیکھتا ہے غرور سے ایسے  
آسمان جیسے صرف باز کا ہے

چاہے دنیا جہان ہے اس میں  
دل اُسی یارِ دل نواز کا ہے

چال ہم سے تو دلبرانہ چل  
جب تعلق نیاز و ناز کا ہے

اب محبت کا یہ سفر معصوم  
ایک ڈوبے ہوئے جہاز کا ہے

عجب کیا سنگ جائے ، سر نہ جائے  
کوئی میری نزاکت پر نہ جائے

محبت کو عبادت کہہ رہا ہے  
سنو ، یہ آدمی بچ کر نہ جائے

کوئی دیکھے ، کہیں یہ سونے والا  
بہت زندہ نہیں تھا ، مرنے جائے

تو کیا سر پھوڑ لے ان پتھروں سے  
اگر بستی سے شیشہ گر نہ جائے

بہت اندر ہی اندر رو رہا ہے  
سمندر آنسوؤں سے بھر نہ جائے

تمہیں ہوتی ہے گر صحرا سے وحشت  
تو کیا مجنوں بھی اپنے گھر نہ جائے

یہی ہے دیکھنا ، معصوم صاحب  
نظر جائے مگر منظر نہ جائے

خوشی نہیں غم پڑتا ہے  
تب دل میں دم پڑتا ہے

ہو جاتا ہے عشق ہوا  
ایسا جو کھم پڑتا ہے

آنچ نہیں رہتی باقی  
شعلہ مدھم پڑتا ہے

ہو جاتی ہے دھوپ بہت  
اور سایہ کم پڑتا ہے

دل کی تان کا دھیان بھی رکھ  
دیکھ کہاں سَم پڑتا ہے

آخر ہجر کی راتوں میں  
کیوں اتنا غم پڑتا ہے

رنگ بھی پھولوں میں معصوم  
کب بے موسم پڑتا ہے

کوئی اُڑنے کو آسمان نہیں  
یا پروں میں ہی تیرے جان نہیں

زمزمہ کوئی تجھ میں کیا پھوٹے  
سُر بدن میں ، لہو میں تان نہیں

خاک کا اور خاک ہو جانا  
کیا ہماری ہی داستان نہیں



آپ سنتے نہیں ہیں بات کوئی  
اور خموشی مری زبان نہیں

جب بھی آجائے جی میں کر دیں بند  
شہر ہے ، آپ کی دکان نہیں

مر چکے ہیں مکین ، حیرت ہے  
اور خالی کوئی مکان نہیں

وصل کا چاند بھی نکلتا ہے  
رات بس ہجر کا نشان نہیں

اب ضروری نہیں کہ سچ بھی ہو  
شعراک بات ہے ، بیان نہیں

آدمی آپ خوب ہیں معصوم  
آپ سے کون بدگمان نہیں

تم بھی بدتر کو بہترین کہو  
اور پھر خود کو آفرین کہو

مل گئے سارے خواب مٹی میں  
اور دُنیا کو اپنا دین کہو

دوست کہنے میں ہیں کئی ابہام  
تم مجھے مارِ آستین کہو

دُور تک کچھ نظر نہیں آتا  
پہلے دیکھا ہے ایسا سین کہو

کہو اُس سے کہ بجھ گئے ہیں گلاب  
جل گئی شاخِ یاسمین کہو

ایک نقطہ بجائے تل ہی سہی  
اب حسیں کیوں اُسے حسین کہو

وہ پرندے ، شجر ، ہوا معصوم  
کیا ہوئے سب معاصرین کہو

لاکھ وحشی ہے خرد باختہ ہے  
دل اُسی شوخ کا پرداختہ ہے

ہم نے کر رکھی ہے اُس لب پہ نثار  
وہ خموشی جو سخن ساختہ ہے

شورشِ شہر کو درکار ہے مرد  
والی شہر مگر آختہ ہے

دیکھیے داد کا طالب بھی نہیں  
مصرعہٴ حُسن کہ بے ساختہ ہے

یہی معصوم ہے فطرت کا مزاج  
کہیں شاہین ، کہیں فاختہ ہے

دریچہ کھلا ہے بیابان کا  
کہ ہے چاک میرے گریبان کا

ترے ہونٹ پھر یاد آنے لگے  
کھلا دھیان میں پھول مرجان کا

وہ چہرے کی اڑتی ہوئی دھوپ سی  
وہ سایہ سا زلفِ پریشان کا

کہانی رہی تو ضرور آئے گا  
مسافر پلٹ کر پرستان کا

کہاں ٹوٹتا ہے وہ انکار سے  
جو رشتہ خدا سے ہے انسان کا

نہ آئے مگر یاد آتا رہے  
کوئی کیا کرے ایسے مہمان کا

نہ مر کے بھی معصوم اگر وہ ملے  
تو پھر فائدہ اتنے نقصان کا

کوئی طرفہ ستم کیا جائے  
شہر کا خوف کم کیا جائے

آئیے مل کے مسکراتے ہیں  
کچھ تو یاروں کا غم کیا جائے

فاصلہ رفتگاں کا کچھ بھی نہیں  
طے اگر ایک دم کیا جائے

قید رکھنا ہے گر اسیروں کو  
آب و دانہ بہم کیا جائے

ہاتھ آئیں صبا کے پر جو کہیں  
قصہ گل رقم کیا جائے

ہم تمہیں یاد تک نہیں کرتے  
اور کیا بنتِ عم کیا جائے

حال دل کا عجیب ہے معصوم  
کیا سپردِ قلم کیا جائے



نقہ تھا اس قدر، کہ نہیں تھا حواس میں  
میں آسمان گھول رہا تھا گلاس میں

سو رنگ مجھ میں ہیں تری تصویر کے لیے  
لیکن وہ رنگ آتے نہیں ہیں قیاس میں

شاید اسی لیے مری محفل اُداس تھی  
تہائی پھر رہی تھی کہیں آس پاس میں

چنگاریاں ہیں اتنی خیالات میں مرے  
میں آگ دیکھتا ہوں ہمیشہ کپاس میں

لاوا اُگل رہی ہے مری بھوک پر زمیں  
سورج دہک رہے ہیں کئی میری پیاس میں

مت میرے ماہ و سال کی رفتار پوچھیے  
میں چل رہا ہوں اب بھی کہیں اتہاس میں

معصوم اپنی ذات کی تہذیب کیا کروں  
آوارگی بدن کی چھپا کر لباس میں

اُس کی تصویر چمک جاتی ہے  
سانس سینے میں اٹک جاتی ہے

ہاتھ آتا ہی نہیں اُس کا خیال  
رنگ پکڑوں تو مہک جاتی ہے

زُلف لہراتی ہے رُخ پر اُس کے  
رات سی دن پہ چھلک جاتی ہے

اُس کے آباد شہتاء کی طرف  
ایک ویران سڑک جاتی ہے

کیوں وہ مہتاب نکلتا ہی نہیں  
روح تک جس کی دمک جاتی ہے

اب یہ عالم ہے کہ بس یاد اُس کی  
دل کے اندر ہی دھڑک جاتی ہے

تن میں لو ہے نہ لہو میں وہ لپک  
پر کہاں دل کی للک جاتی ہے

بجھ سے جاتے ہیں ستارے معصوم  
آہ جب سوئے فلک جاتی ہے

نہ جلتا ہے نہ بجھتا ہے نظر میں  
ہے کیا روشن مکانِ خیر و شر میں

جگائے گا مجھے پھر کون آ کر  
اگر سو جاؤں میں خوابِ سفر میں

ہے یہ کس آسماں سے خاک میری  
بہت اڑتی ہے میرے بال و پر میں

تو جنگل سانس لیتا ہے مرا بھی  
ہوا چلتی ہے تصویرِ شجر میں

نکل سکتا ہوں میں زنجیر اپنی  
مجھے رکھو نہ زندانِ خبر میں

دکھا دو دشت دیوانے کو کوئی  
نہ اُلجھاؤ اسے دیوار و در میں

کبھی یاد آئے گی معصوم اُس کی  
مسافر لوٹ کر آئے گا گھر میں

دھنک کو دیکھیے تو جی لگا کے  
یہ سارے رنگ ہیں اُس بے ادا کے

ڈراتے ہیں مجھے صورت سے میری  
عجب ہیں آئے دشتِ بلا کے

ہوا کا کیوں بھلا احسان لیتا  
میں خود ہی بجھ گیا ہوں جل جلا کے

کوئی تو بات ہے جو دیکھتا ہوں  
میں اپنے دشمنوں کو مسکرا کے

نکل سکتی ہے گنجائش مری بھی  
جگہ اتنی تو ہے اندر خلا کے

یہ چلتے ہیں تری زلفوں سے لگ کر  
بہت آوارہ ہیں جھونکے ہوا کے

وہی ہوتا نہیں معصوم میرا  
جسے رکھتا ہوں میں دل سے لگا کے



زہر مجھ میں جو ہے محبت کا  
یہی باعث ہے میری نفرت کا

گو ضروری نہیں مگر پھر بھی  
دھیان رکھیے مری ضرورت کا

دل مرا ، خانہ سیاہ مرا  
گھر ہے یہ بھی کسی مصیبت کا

چھپ سے جاتے ہیں سارے عیب اس میں  
ہے یہی فائدہ شرافت کا

کانپتا ہے مکاں بھی ساتھ مرے  
اب وہ عالم ہے میری دہشت کا

میرے اندر نہ سو رہی ہو کہیں  
منتظر ہوں میں جس قیامت کا

ایک دشتِ عجیب تھا جس میں  
مرد سایہ تھا ایک عورت کا

رات مجھ کو ڈرا رہا تھا کوئی  
اور وہ تھا بھی میری صورت کا

مجھ سے معصوم کھو گیا افسوس  
کیا نگیں تھا وہ دل کی قیمت کا

بے درد ، ترے درد کا احساس کروں کیا  
تُو پاس نہیں ہے تو ترا پاس کروں کیا

ایسی ہی بنا دوں تری دُنیا کی میں تصویر  
وہ خواب جو دیکھے ہیں ، انھیں ناس کروں کیا

یہ دل کئی لوگوں کی محبت سے بھرا ہے  
پر تُو یہ بتا ، تیرے لیے ، خاص کروں کیا

صحرا میں اُگا دوں میں تری بھوک کے مشروم  
جو مجھ کو لگی رہتی ہے وہ پیاس کروں کیا

جب بزمِ طرب مجھ کو سجانی ہی نہیں ہے  
یہ تیرے مغنی ، ترے رقاص کروں کیا

آنا ہی نہیں تجھ کو ، مری جان کے دشمن  
اُمید رکھوں تجھ سے ، تری آس کروں کیا

آتی ہے اُن آنکھوں کی چمک چاروں طرف سے  
چبھتی ہے یہ تابانی الماس کروں کیا

وحشت سہی معصوم مگر جاؤں کہاں میں  
جب خود ہی میں جنگل ہوں تو بن باس کروں کیا

میں عشق سے جب نہ باز آیا  
تو دل میں آخر گداز آیا

وہ جس کو آنا تھا، آچکا ہے  
اٹھو کہ وقتِ نماز آیا

عجیب مقتل سجایا اُس نے  
کہ جو گیا ، سرفراز آیا

دکھائی دینے لگا وہ ہر دم  
نظر میں کیا ارتکاز آیا

نہ جب چمن میں بہار آئی  
تو پھر وہی فتنہ ساز آیا

نہ کام آیا کوئی ہمارے  
مگر وہی بے نیاز آیا

تمام لوگوں پہ کھل گیا تو  
ہمارے سینے میں راز آیا

عجب پریشان ، اُلجھا اُلجھا  
خیالِ زلفِ دراز آیا

سوالِ معصوم ، میرِ پوچھا  
جوابِ احمد فراز آیا

بدن سے سیر کو ایسے بدی نکلتی ہے  
کہ زور و شور سے جیسے ندی نکلتی ہے

ازل سے ٹوٹا ہوا ہے ہمارے دل کا ساز  
اسی لیے تو صدا سردی نکلتی ہے

ہے بے حساب بہت ریگِ شیشہٴ ساعت  
کہ ذرّے ذرّے میں گویا صدی نکلتی ہے

غلام تنگ بہت آگیا ہے دنیا سے  
مگر یہ دل سے کہاں سیّدی نکلتی ہے

وہاں تو آج تک میں بھی نہیں گیا معصوم  
وہ جن حدوں سے مری بے حدی نکلتی ہے

منتظر تھے بس اک دراڑ کے سب  
ولوے ڈھے گئے پہاڑ کے سب

جتے نقش و نگار تھے مجھ میں  
عشق نے رکھ دیے بگاڑ کے سب

ایک دو شہر میرے رہنے دے  
کیا ملے گا تجھے اُجاڑ کے سب



دشتِ دل میں تھے جو خوشی کے غزال  
کھالے غم نے چیر پھاڑ کے سب

دیکھ کتنے مزے سے بیٹھا ہوں  
خواب اپنے زمیں میں گاڑ کے سب

کچھ بھروسا نہیں مسافر کا  
چل پڑے کب یہ چھوڑ چھاڑ کے سب

اپنی صورت نظر نہیں آئی  
گرد بھی آنسو کی جھاڑ کے سب

جھانکیے تو وجود میں میرے  
اس میں منظر ہیں مار دھاڑ کے سب

میں تھا معصوم ایک ، اور دشمن  
مجھ کو بیٹھے ہوئے تھے تاڑ کے سب

معنی رکھتی ہے نہ بے معنی ہے  
میری آنکھوں میں جو حیرانی ہے

اس میں مرنے کی سہولت ہے بہت  
زندگی میں یہی آسانی ہے

دشت و در میں نہ سہی، دل میں سہی  
بھائی ویرانی تو ویرانی ہے

کھلی آنکھوں سے نظر آئے بھی کیا  
سات پردوں میں جو عریانی ہے

چیزیں آپس میں الجھتی ہیں بہت  
مسئلہ یہ مگر انسانی ہے

کھیل لفظوں کا سمجھتے ہو جسے  
ایک عالم کی نگہبانی ہے

جائے معصوم، تو جائے بھی کہاں  
یہ جو اندر کی بیابانی ہے

ہوں شہر کا باشندہ نہ جنگل کا ہوں باسی  
رہتا ہوں وہاں میں ، جہاں رہتی ہے اداسی

کھلتا ہے مرے سامنے افلاک کا منظر  
بنتی ہے مری آنکھ میں تصویر ذرا سی

آباد نظر آتے ہیں اک اور جہاں میں  
ویران مکانوں میں یہ ہوتی ہے ادا سی

یہ بھی تو کوئی راہ دکھانے کے لیے ہے  
اندر کے اندھیرے میں جو ہوتی ہے ضیا سی

معصوم دھڑکتے ہیں مرے دل میں زمانے  
اور وقت میں چلتی ہے مرے ساتھ ہوا سی

ہوا ہے ، پھول ہے ، آبِ رواں ہے  
مرے اندر کی ویرانی کہاں ہے

در و دیوار سے وحشت ٹپکنا  
در و دیوار کا حسنِ بیاں ہے

ذرا یہ شاعری بھی پڑھ کے دیکھو  
یہ اک مُردے کی زندہ داستاں ہے

جوانی میں کھلا تھا پھول کوئی  
مرے دل پر ابھی تک اک نشاں ہے

مجھے باہر نظر آتا نہیں کچھ  
مرے اندر غبارِ کارواں ہے

اگر پیروں میں ہوتا ، خاک ہوتا  
ہمارے سر پہ ہے ، سو آسماں ہے

در و دیوار میں طوفان کیسا  
مگر معصوم صاحب کا مکاں ہے

بن بھی سکتی ہے یہ تصویر بنا کر دیکھو  
آتش غیب سے کچھ پھول کھلا کر دیکھو

تم پہ کھل جائیں گے جوہر مری یکتائی کے  
یوں نہ دیکھو مجھے اوروں سے ملا کر دیکھو

آئینہ اپنے ہی بارے میں بتائے کیسے؟  
کیسا لگتا ہوں کسی دن مجھے آ کر دیکھو

سو حجابات ہیں میرے بھی ، تماشا ہی سہی  
دیکھنا ہے تو مجھے مجھ سے چھپا کر دیکھو

اب وہ ایسا بھی کوئی گوہرِ نایاب نہیں  
مل بھی سکتا ہوں کسی خواب میں جا کر دیکھو

شاید اس سے کوئی تسکین کی صورت نکلے  
اپنے اندر ہی سہی حشر اٹھا کر دیکھو

صرف سُن کر ہی نہ اندازہ لگاؤ معصوم  
شور کتنا ہے ، یہ خود شور مچا کر دیکھو



کچھ میری زمیں تھی یہاں دریاؤں سے پہلے  
مجھ سے کہیں پہلے، مرے آقاؤں سے پہلے

آتی ہے بہت بعد میں زنجیر کی آواز  
اب راہ اُلجھتی ہے مرے پاؤں سے پہلے

تہذیب نہیں تھی مگر آباد تھے ہم لوگ  
کہتے ہیں یہاں شہر تھے، صحراؤں سے پہلے

لگتا ہے کہ یہ بھی کسی وحشت کا اثر تھا  
معلوم تھا سب کچھ ہمیں داناؤں سے پہلے

آتی ہیں ہوائیں بھی مگر اب نہیں آتے  
پیغام جو آتے تھے مجھے گاؤں سے پہلے

احساس بھی اتنا ہمیں شدت کا نہیں تھا  
پھر دھوپ بھی کچھ کم تھی یہاں چھاؤں سے پہلے

معصوم یہاں اب تو نشان تک نہیں ملتا  
ہوتی تھی غزل قافیہ پیاؤں سے پہلے

ایک انبوہ تماشا ہوں میں تنہا ہو کر  
اور دُنیا کا نہیں ، آپ ہی دُنیا ہو کر

کوئی نیرنگِ شب و روز ہے ویرانی کا  
زندگی پائی ہے اِس شہر نے مردہ ہو کر

جب تھی نایاب تو ہر وقت نظر آتی تھی  
کیسی تصویر ہے ، جو گم ہے مہیا ہو کر

پھر ترے نغمہ صد رنگ سے ٹکرائی ہے  
اک خموشی ، مری آواز سے پیدا ہو کر

تھا کبھی جلوہ نما یوسفِ ثانی میرا  
میں بھٹکتا ہوں جہاں خوابِ زلیخا ہو کر

دشتِ حیرت میں سنا ہے ، کوئی دیوانہ ہے  
آنہ دیکھتا رہتا ہے ، جو اندھا ہو کر

ساخہ ہوں تو گزر جاؤں کسی پر معصوم  
گر قیامت ہوں تو دیکھوں کہیں برپا ہو کر

دل کو بھی کچھ سکوں ہو ذرا درد چاہیے  
اس آئینے پہ تھوڑی بہت گرد چاہیے

ترنیں یوں کرے کہ یہ چیزیں بکھیر دے  
اس گھر کو اب تو ایسا کوئی فرد چاہیے

بیمار ہو گیا ہے ہوائے بہار سے  
اب جا کے دیکھنا وہ گل زرد چاہیے

میں ملتمس ہوا تو وہ کہنے لگی مجھے  
جو قتل ہو سکے ، وہ مجھے مرد چاہیے

معصوم عشق ، اُس پہ یہ نازک مزاجیاں  
جلنا ہے اور آگ تجھے سرد چاہیے

چمک چمک کے ستارے مجھے بلاتے ہیں  
میں چپ رہوں، تو یہ سارے مجھے بلاتے ہیں

مرا وجود ہی سب سے بڑا اثاثہ تھا  
ڈبو دیا تو کنارے مجھے بلاتے ہیں

کبھی پُکارنے لگتے ہیں بام و در مجھ کو  
کبھی چراغ تمہارے مجھے بلاتے ہیں

مراجعت ہے مری اپنے آنسوؤں کی طرف  
کہ خود مرے ہی نظارے مجھے بلاتے ہیں

ستم تو یہ ہے کہ آواز تک نہیں آتی  
مگر کہیں مرے پیارے مجھے بلاتے ہیں

بس ایک دن مجھے اُن وادیوں میں جانا ہے  
مرے فراق کے مارے مجھے بلاتے ہیں

چلا بھی جاتا ہوں معصوم بزمِ یاراں میں  
کبھی کبھی تو بچارے مجھے بلاتے ہیں

کمرے سے اک روز نکل کر دیکھوں گا  
بارش میں اور دھوپ میں چل کر دیکھوں گا

آگ جلانا سیکھ رہا ہوں ابھی تو میں  
جل جائے، تو میں بھی جل کر دیکھوں گا

لفظوں سے پہچان لیا جاتا ہوں میں  
اب کی بار آواز بدل کر دیکھوں گا



تم ہر سانچے میں کیسے ڈھل جاتے ہو  
کہتے ہو تو میں بھی ڈھل کر دیکھوں گا

خون بہانے سے آخر کیا ملتا ہے  
اک دن کوئی پھول مسل کر دیکھوں گا

گر جاتا ہوں روز ہی میں اونچائی سے  
آج ذرا یہ خواب سنبھل کر دیکھوں گا

اب معصوم میں اچھی اچھی باتوں میں  
اپنا سارا زہر اُگل کر دیکھوں گا

اُس خوش ادا کے آئنے خانے میں جاؤں گا  
پھر لوٹ کر میں اپنے زمانے میں جاؤں گا

رہ جائے گی یہ ساری کہانی یہیں دھری  
اک روز جب میں اپنے فسانے میں جاؤں گا

یہ صبح و شام یوں ہی رہیں گے مرے چراغ  
بس میں تجھے جلانے بجھانے میں جاؤں گا

یہ کھیل ہے تو خوب مگر تیرے ہاتھ سے  
اس ٹوٹنے، بگڑنے، بنانے میں جاؤں گا

یونہی میں خود کو خواب دکھانے میں آ گیا  
یونہی میں خود کو خواب دکھانے میں جاؤں گا

معصوم، آئینہ مجھے آئینِ مرگ ہے  
میں اس سے اپنے عکس چرانے میں جاؤں گا

اُڑا شاخ سے اور فلک ہو گیا  
مجھے تو پرندے پہ شک ہو گیا

یہ اک شعر احساس پر بوجھ تھا  
مگر آج کیا بے دھڑک ہو گیا

تو پھر ساری بستی کہاں جائے گی  
میں جنگل اگر یک بہ یک ہو گیا

بہت ذوق تھا رنگ و رُخ سے ہمیں  
مگر صرفِ نان و نمک ہو گیا

وہ شعلہ ہوں، جو تیرے دل میں بجھا  
مگر تیرے رُخ کی چمک ہو گیا

کام تُو نے کیا تمام مرا  
اے اُداسی تجھے سلام مرا

رات ہوں میں، چراغ ہوں، کیا ہوں  
روشنی پوچھتی ہے نام مرا

میں ہوں اپنے خیال کی تقریب  
کیا کرے کوئی اہتمام مرا

زندگی سے تو ہارنے کا نہیں  
کر کوئی اور انتظام مرا

ظرف ہے اور چیز، صبر ہے اور  
بھرنے والا نہیں ہے جام مرا

گو تری ہی طرف ہے رُوئے سخن  
پھر بھی تجھ سے نہیں کلام مرا

اُس کو میں بے وفا نہیں کہتا  
ہے یہی اُس سے انتقام مرا

جب نشاں تک نہیں مرا معصوم  
کیسے باقی رہے گا نام مرا

گھر کے لوگوں کو جگاتا کیوں نہیں  
مر چکا ہے تُو ، بتاتا کیوں نہیں

رات دن دیوار و در کے حال پر  
رونے والے ، مسکراتا کیوں نہیں

ہے خموشی ہی خموشی کا جواب  
بات کو آگے بڑھاتا کیوں نہیں

باغ کا کیا ہے ، ابھی کھل جائے گا  
جس کا موسم ہے وہ آتا کیوں نہیں

حُسن کوئی ابر کا محتاج ہے  
اپنی خوشبو میں نہاتا کیوں نہیں

آپ کہیے ، خسروِ شریر مقال  
دل پرندہ ہے تو گاتا کیوں نہیں



ہم کو ایک زمانے تک  
روئیں گے ویرانے تک

گل کے ساتھ رہے گا کون  
کھلنے سے مرجھانے تک

درد نے دل کو ڈھونڈ لیا  
پہنچا سانپ خزانے تک

شہر تو ہو جائے گا راہ  
آپ کے کچھ فرمانے تک

رُخ سے ترے چراغ تو کیا  
جلتے ہیں پروانے تک

وحشت ہو تو ایسی ہو  
دشت آئے دیوانے تک

بات بنے گی کیا مجھ سے  
بنتے نہیں بہانے تک

بیت گئی معصوم بہار  
رنگ آنکھوں میں آنے تک

# مصنف کی دیگر کتابیں

اور کہاں تک جاتا ہے

(اردو شاعری)

۲۰۰۰ء

ہمساز دست

(آغا سلیم کے سندھی ناول کا اردو ترجمہ)

۲۰۰۲ء

نیشنل ریجنل پبلشرز

(ماہنامہ شاعری)

۲۰۱۶ء

## Rang-e-Adab Publications

Office # 5 - Kitab Market, Urdu Bazar, Karachi.

0345-2610434

021-32761100

rangeadab@yahoo.com

0336-2085325

0300-2054154

/rangeadab

